اللہ تعالیٰ کا

انسانوں اور اہل ایمان سے

مطالبہ

ترتیب وتالیف

رحمت اللہ بٹر

مرکزی شعبۂ تعلیم وتربیت

شائع کردہ

تنظیم اسلامی

دارالاسلام مرکز تنظیم اسلامی، ملتان روڈ چوہنگ، لاہور 53800

فون: 78-35473375(042)

ای میل: markaz@tanzeem.org ویب سائٹ: www.tanzeem.org

ترتیبِ عنوانات

عبادتِ ربّ 2

دینِ اسلام کا ایمان والوں سے مطالبہ 22

مقام وفضیلتِ اُمت 33

مقصدِ بعثتِ انبیاء ورسل 38

الہدیٰ کی شہادت 56

دین الحق کی شہادت 61

نبی اکرم ﷺ کی خُصوصی حیثیت 66

التزامِ جماعت 70

عبادتِ ربّ

دینِ اسلام ایمانیات' عبادات' رسومات کے ساتھ ساتھ معاشرتی' معاشی اور سیاسی نظام پر مشتمل ہے' جو ہماری زندگی کے مختلف گوشے ہیں۔ ان کو" دین اسلام کے چھ گوشے" نامی کتابچہ میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب ہمیں یہ جاننا ہے کہ اس دین کی رُو سے اللہ تعالیٰ کا ہر انسان سے کیا مطالبہ ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کو اپنا رب ماننے والوں سے کیا تقاضا ہے تا کہ ہر انسان یہ جان کر اپنے لیے کامیابی کی سیدھی راہ اختیار کر سکے۔

قرآنِ مجید کا جو مطالبہ پوری انسانیت سے ہے وہ ہے عبادتِ ربّ۔

قافلۂ تنظیمِ اسلامی میں شمولیت کے بعد یہ احساس بیدار ہوا کہ بحیثیت مسلمان ہم میں سے ہر ایک پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کرے اور حضرت محمد ﷺ کے اُمتی ہونے کے تعلق سے دین کے وہ فرائض ادا کرے جو اس پر عائد ہوتے ہیں۔ نتیجتاً قرآنِ مجید کی طرف رغبت[1] بڑھی اور اس کا مطالعہ ہونے لگا۔ بہت سی حقیقتیں تو محترمی و مربّی[2] ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے دروس سے منکشف[3] ہوئیں لیکن بعض کی طرف قرآنِ مجید نے از خود رہنمائی کی۔ ان حقائق میں سے ایک حقیقت "عبادتِ رب" ہے۔ عبادت اور رب کا تعلق اور پھر بندگی کے تقاضے ایک ترتیب سے ذہن میں ایسے سمائے کہ بہت سے اشکالات[4] خود بخود حل ہو گئے۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ کے ذریعے دینی فرائض کا جو تصور علیحدہ علیحدہ اصطلاحات کے ذریعے سامنے آیا تھا وہ ایک نئی ترتیب سے واضح ہوا اور جب راقم الحُروف[5] نے تربیت گاہوں میں" دینی فرائض کا جامع تصور" کے موضوع پر لیکچر دینا شروع کیا تو اسی

(۱) شوق (۲) تربیت دینے والا (۳) ظاہر (۴) مشکلات (۵) تحریر لکھنے والا

ترتیب کے ساتھ رفقاء کے سامنے بات رکھنے کی کوشش کی۔ اب تحریر کے ذریعے کوشش کر رہا ہوں کہ اس فکر کو عام کروں۔ تحریر و تصنیف کے ضمن میں اپنی بے بضاعتی[1] کا احساس ہے' لیکن اللہ کے بھروسے پر اس کام کا آغاز کیا ہے۔ وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَۃِ۔ (اور اوّل و آخر میں توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے)

سورۂ یٰسین میں اللہ تعالیٰ نے پیشگی آگاہ کر دیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایسے انسانوں سے باز پُرس[2] کریں گے جنہوں نے اللہ کی عبادت پر اپنی زندگی نہ گزاری ہوگی۔

﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾﴾ (یٰسٓ:60 تا 61)

"اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہیں کرو گے کیونکہ وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے اور یہ کہ تم میری ہی بندگی کرو گے۔ یہ تھا سیدھا راستہ (جو تمہیں اختیار کرنا چاہیے تھا)۔"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی کوئی ایسا عہد ہے جو ہم نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا جس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ قرآن مجید اس بات کا جواب اِثبات میں دیتا ہے کہ ہاں ایسا ہوا تھا۔ چنانچہ سورۃُ الاعراف میں اس کا بڑے اہتمام سے ذکر کیا گیا ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ

(۱) بے سروسامانی (۲) پوچھ گچھ

الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾ (الاعراف:173 تا174)

"(یاد کرو) جب تیرے رب نے آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو خود ان کی جانوں پر گواہ ٹھہرایا اور پوچھا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ (اس پر) تمام انسانوں نے اقرار کیا: کیوں نہیں! ہم اس پر گواہ ہیں۔ (ہم نے یہ عہد اس لیے لیا کہ) مبادا[1] تم قیامت کے دن یہ کہہ دو کہ ہم اس سے غافل تھے یا یہ کہ ہمارے باپ دادا نے شرک کیا ہم سے پہلے اور ہم ان کی اولاد تھے (اس لیے ہم بھی مشرک ہو گئے)' تو کیا تُو ہمیں ان غلط کار لوگوں کی وجہ سے ہلاکت میں ڈالے گا؟ ہم اس طرح کھول کھول کر اپنی آیات کو بیان کر رہے ہیں تاکہ وہ باز آ جائیں اور ہماری طرف رُجوع کریں۔"

گویا اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طرف سے پیش کیے جانے والے دونوں بہانوں کو رد کرنے کے لیے یہ عہد لیا تھا۔ ایک یہ کہ وہ کہہ دیں کہ ہمیں تو کسی نے بتایا ہی نہیں کہ ہمارا رب کون ہے اس لیے ہم کس کی بندگی کرتے اور دوسرے یہ کہ آباء پرستی[2] تقلید[3] یا زمانے کے چلن کا عذر بھی نہ رہے چنانچہ یہ عہد ہر انسان سے فرداً فرداً لے لیا گیا تھا۔

اب یہاں دو باتیں توجہ طلب ہیں۔ اوّل یہ کہ عہد تو اللہ کے رب ہونے کا لیا گیا لیکن باز پُرس اس پر کی جا رہی ہے کہ میری بندگی کیوں نہیں کی۔

دوم یہ کہ ہمیں تو یہ عہد یاد ہی نہیں ہے اس لیے ہم اس کے تقاضے کیسے پورے کریں!

پہلی بات یہ ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ عہد یاد رکھنے والا نہیں ہے بلکہ اس کو فطرتِ انسانی بنا دیا گیا ہے کہ انسان جسے شعوری طور پر رب سمجھتا ہے اس کی بندگی لازماً کرتا ہے

(۱) ایسا نہ ہو (۲) باپ دادا کی اندھی پیروی (۳) پیروی

اور یہ فطرت تبدیل نہیں ہوتی۔ چنانچہ سورۃ الرُّوم میں فرمایا گیا:

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾ (الروم:30)

"پس اپنے رخ کو اللہ کی اطاعت پر یکسُو کر لو۔ یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی۔" ﴿یہ عہد ارواح انسانی سے لیا گیا تھا اور اس روح میں سمو دیا گیا ہے۔﴾

یہی حقیقت ہے جس کو نبی اکرم ﷺ نے بایں الفاظ[1] بیان فرمایا ہے:

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلاَّ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَوْ يُشَرِّكَانِهٖ)) (مُسند احمد)

"ہر بچہ فطرت (رب کا شعور) پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی، مجُوسی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔" (ایک اور روایت میں آیا ہے کہ "یا اسے مشرک بنا دیتے ہیں۔")

یعنی یہاں اس کا رب بدل دیتے ہیں، فطرت نہیں بدلتی۔

رہا پہلا سوال کہ عہد رب ہونے کا لیا ہے اور پوچھا جا رہا ہے بندگی کے بارے میں تو اس کو سمجھنے کے لیے جاننا ہوگا کہ رب کسے کہتے ہیں اور رب کو ماننے کا تقاضا کیا ہے۔ جان لیجیے کہ عربی میں رب کے بنیادی معنی مالک کے ہیں۔ جیسے رَبُّ الدَّارِ گھر کا مالک، رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمانوں اور زمین کا مالک۔ مولانا علی میاںؒ[2] نے سیرت حضرت علیؓ میں وہ واقعہ نقل کیا ہے جب یمن کے گورنر ابرہہ نے خانہ کعبہ کو گرانے کے ارادے سے مکہ پر چڑھائی کی تھی۔ وہ جب مکہ پہنچا اور پڑاؤ کیا تو اس کے لشکری عربوں کے اونٹ گھیر لائے۔ ان میں حضرت عبدالمطلب کے اونٹ بھی تھے۔ چنانچہ وہ

(۱) ان الفاظ میں (۲) مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

ابرہہ کے پاس گئے۔اس نے بڑی آؤ بھگت کی کہ سردارِ مکہ آیا ہے' میری منت سماجت کرے گا لیکن حضرت عبدالمطلب نے کہا تو یہ کہ میرے اونٹ واپس کردو۔اس پر اسے بہت حیرت ہوئی کہ تمہیں اونٹوں کی پڑی ہے اور میں تمہارا معبد[1] گرانے آیا ہوں۔ اس پر حضرت عبدالمطلب نے کہا: ((اَنَا رَبُّ الْاِبِلِ وَاِنَّ لِلْبَیْتِ رَبًّا سَیَمْنَعُهٗ)) "میں اونٹوں کا مالک ہوں' اس لیے اونٹ لینے آیا ہوں اور بے شک بیت اللہ کا بھی ایک مالک ہے' وہ اس کی خود حفاظت کرے گا"۔تو انہوں نے لفظ رب استعمال کیا مالک کے لیے۔یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ کعبہ کو اللہ ہی کا گھر مانتے تھے۔

سورۂ قریش میں خاص طور پر یہ لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے اور اسی بنیاد پر قریشِ مکہ سے بندگی کا تقاضا کیا گیا ہے:

﴿فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝٣ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝٤﴾ (قریش:3 تا4)

"ان کو بندگی کرنی چاہیے اس گھر کے مالک کی جو انہیں بھوک میں کھانا کھلاتا ہے اور خوف سے امن بخشتا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ یہی دو صفات یا ذمہ داریاں ہیں جو ہر مالک کی ہوتی ہیں' یعنی جس کا وہ مالک ہے اس کی پرورش کا سامان مہیا کرے اور اس کی حفاظت کا بندوبست کرے اور اس کے عِوَض وہ اس کی بندگی کرے اور یہی فطرت انسانی ہے کہ جسے حاجت روا[2] اور مشکل کشا سمجھتا ہے اس کی ہی بندگی کرتا ہے یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن مجید انسانوں کے ذہن نشین کرواتا ہے کہ وہ اپنے مالکِ حقیقی کو پہچانیں تاکہ وہ اس کی بندگی کریں۔چنانچہ قرآن مجید کے شروع ہی میں تمام انسانوں سے جو بندگی کا تقاضا کیا گیا ہے وہ اسی بنیاد پر کیا گیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ

(۱) عبادت گاہ (۲) ضرورت پوری کرنے والا۔

قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝٢١ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝٢٢﴾ (البقرۃ:21 تا22)

"اے انسانو! بندگی کرو اپنے مالک کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں' تاکہ تم بچ جاؤ۔(وہ مالک) جس نے زمین کو تمہارے لیے بچھا دیا ہے اور آسمان کو چھت بنایا ہے اور پھر اس نے بلندی سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے سے تمہارے لیے انواع و اقسام[1] کے میوے پیدا کیے پس (اس کی بندگی میں) کسی کو اس کا ہمسر[2] نہ ٹھہراؤ اور یہ حقیقت تم جانتے ہو (کہ زمین پیدا کرنے والا وہی ہے اور آسمان کے ذریعے حفاظت کا بندوبست کرنے والا وہی ہے۔)"

یہ دونوں صفات ایسی بیان کی گئی ہیں اللہ کے رب (مالک) ہونے کی کہ دنیا میں بہت سے سرکشوں[3] نے رب ہونے کا دعویٰ تو کیا لیکن کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ زمین میں نے پیدا کی ہے یا آسمان میں نے بنایا ہے اور بارش میں برساتا ہوں۔اس لیے قرآنِ مجید نے وہ نشانیاں بیان کی ہیں جو اصل مالک کے لیے مخصوص ہیں۔یہ "مطالبۂ عبادت" اللہ کے رب ہونے کے ناتے[4] سے ہے اور تخلیق کا ذکر تو اس لیے کیا ہے کہ جن کو تم رب مانتے ہو وہ تو اس کی مخلوق ہیں خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء و رسل یا اولیاء اللہ' جیسے تم اس کی مخلوق ہو' اور پھر رب کی صفات بیان کر دیں تاکہ اپنے رب کو پہچان لیں۔ دیکھئے کس طرح قرآن مجید نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۭ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ (ھود:6)

(۱) مختلف قسموں کے (۲) برابر کا۔ہم رُتبہ (۳) باغیوں (۴) تعلق

"اس زمین پر کوئی جاندار نہیں ہے مگر اللہ کے ذمہ ہے اس کا رزق' (اس لیے) وہ ہر مخلوق کی جائے قرار[1] کو جانتا ہے اور اس کے لوٹنے کی جگہ کو بھی جانتا ہے۔ یہ سب کچھ واضح طور پر لکھا ہوا ہے۔"

اسی طرح فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ...﴾ (النحل:71)

"اور اللہ ہی ہے جس نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری عطا کی ہے۔"

اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو بار بار قرآن مجید میں دہرایا گیا ہے کہ:

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا﴾ (بنی اسرائیل:30)

"بیشک تیرا رب کشادہ کر دیتا ہے رزق جس کے لیے چاہتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ناپ تول کر دیتا ہے۔ بیشک وہ خوب باخبر ہے اپنے بندوں سے' اور ان کو دیکھ رہا ہے۔"

اس معاملے میں انسان کو خاص طور پر مخاطب کر کے فرمایا:

﴿وَلَآ تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا﴾ (بنی اسرائیل:31)

"اپنی اولاد کو رزق کی تنگی کے ڈر سے قتل نہ کرنا' کیونکہ ہم رزق دینے والے ہیں ان کو بھی اور تمہیں بھی۔ یقیناً اُن کو قتل کرنا بہت بڑی خطاء ہے۔"

تم جب آئے تھے تو کون سی ضمانت لے کر آئے تھے کہ تمہیں رزق مل جائے گا اور اب اوروں کے لیے فکر مند ہو۔ یہ خوب جان لینا چاہیے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے صلاحیتیں اور قوّتِ کار بخشی ہے اور اس کائنات میں اس کے لیے وسائل بھی مہیا کیے ہیں

(۱) قیام کی جگہ

کہ اپنی روزی حاصل کرے اور اس کے لیے محنت کرے لیکن روزی کا پالینا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ واضح فرما رہے ہیں۔

چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ انسان جسے بھی اپنا روزی رساں' مشکل کشا اور محافظ سمجھتا ہے اسی کی بندگی کرتا ہے کیونکہ یہ اس کی فطرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعے انسانوں کو باور کرایا ہے کہ:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (العنکبوت:17)

"بیشک جن کی تم بندگی کرتے ہو اللہ کے سوا وہ تمہارے رزق کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ پس تم اللہ کے ہاں سے ہی رزق کے خواہاں[1] بنو اور پھر اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر بجالاؤ اور یاد رکھو کہ تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (وہ پوچھ لے گا کہ اس کے دیے ہوئے رزق کو اوروں کی طرف کیوں منسوب[2] کیا اور پھر ان کی بندگی کیوں کی)۔"

اصل بات تو یہ ہے کہ رزق اور اجل کا معاملہ ایسا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مُعیّن کر دیا ہے اور یہی دو خطرات ہیں جن کے بارے میں انسان اپنے مالک حقیقی کو چھوڑ کر دوسروں کو ان کا مالک و مختار سمجھ لیتا ہے تو ان کی طرف رجوع کرتا ہے اور ان باطل ارباب[3] سے اپنے لیے روزی اور حفاظت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر ان ہی کا بندہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ حالانکہ رزق اور عزت کی حقیقت یہ ہے کہ:

﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝﴾ (الفجر:15 تا 16)

(۱) خواہش مند (۲) نسبت دینا (۳) جھوٹے ربّ

"انسانوں کا معاملہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس کو آزماتا ہے اور اسے دنیا کی آسائشوں سے نوازتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت بخشی ہے' اور جب وہ آزمائش کے لیے اس پر رزق میں تنگی کرتا ہے تو پکار اٹھتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا ہے۔"

حالانکہ دونوں کیفیتوں کا معاملہ صرف انسان کی آزمائش کے لیے ہے کہ وہ اس اَجَلِ مُعیّن [1] کو کیسے گزارتا ہے اور اس رزق کو کس طرح حاصل کرتا ہے۔ آیا اللہ کو رب مان کر جائز طریقے سے محنت کرتا ہے یا بجائے خود مالی وسائل کو رازق سمجھ کر جائز و ناجائز ہر طرح کے ذرائع سے رزق حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بس یہی وہ فرق ہے جو اس کی زندگی کے بارے میں انسان کے تصور میں واقع ہوتا ہے۔ پھر وہ اسی تصور کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ اگر کسی کو یہ یقین ہو جائے کہ رازق اور زندگی کی مہلت دینے والا صرف مالک کائنات ہے تو پھر وہ اللہ کے سوا کسی اور کا بندہ نہیں بنتا' اور اپنی عزّتِ نفس [2] کسی بھی قسم کے لالچ میں آ کر نہیں بیچتا' بلکہ ہر مشکل میں اپنے مالکِ حقیقی کی طرف رُجوع کرتا ہے اور ہمیشہ جائز محنت کرتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ رزق دینے والے کے ہاتھ میں میرا رزق ہے اور اس نے یہ وسائل جائز طریقے سے اور ظلم سے بچ کر استعمال کے لیے پیدا کیے ہیں اور یہی ہماری آزمائش ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اے لوگو! کوئی چیز تمہیں زیادہ قریب نہیں کرتی جنت سے اور دور نہیں ہٹاتی دوزخ سے مگر جو میں نے تمہیں حکم کی ہیں اور کوئی چیز دور نہیں کرتی جنت سے اور نزدیک نہیں کرتی آگ کے مگر وہ جن سے میں نے روکا ہے اور جبرئیل علیہ السلام نے میرے دل میں یہ اِلقاء [3] کیا ہے کہ کوئی نفس اپنا رزق مکمل ہونے سے پہلے نہیں مرتا' تو خبردار اللہ (کی نافرمانی) سے

(۱) مقررہ وقت (۲) ذاتی وقار (۳) دل میں بات ڈال دینا۔

ڈرو اور پاک طریقے سے (رزق) چاہو اور رزق کی جلدی پا لینے کی خواہش تمہیں ناجائز طریقوں سے حاصل کرنے پر آمادہ نہ کرے کیونکہ اللہ کے ہاں جو کچھ ہے اس کو اللہ کی فرمانبرداری ہی سے پایا جانا چاہیے۔"

(بیہقی)

دوسری اہم بات یہ ہے کہ انسان عبث [1] ایسی چیز کے پیچھے لگا رہتا ہے جو خود اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے' یعنی رزق۔

تیسری بات اہم تر یہ ہے کہ انسان رزق کی ہَوَس میں سمجھ بیٹھتا ہے کہ حلال ذریعہ سے رزق تھوڑا حاصل ہوتا ہے جبکہ حرام ذرائع سے جلدی اور زیادہ۔ حدیث اسے یہ سمجھاتی ہے کہ تمام مخلوق کا رزق اللہ کے پاس ہے تو پھر جس کے ہاتھ میں رزق ہے تم اس کی مخالفت کو کیسے رزق کا ذریعہ سمجھتے ہو! یہاں حلال ذرائع پر اتنا ہی زور ہے جتنا تقویٰ (حرام سے بچنے) پر اور اس کا سہل [2] نسخہ تقدیرِ رَبّانی کو یاد رکھنا ہے۔

دوسرا معاملہ ہے حفاظت کا' تو جان لیجیے اللہ تعالیٰ نے ہر شخص پر نگران مُعیّن کر رکھے ہیں جو اس کی حفاظت کرتے ہیں اور جب اجلِ مُعیّن آ جائے تو کسی کو اس کے محافظ نہیں بچا سکتے خواہ کیسا ہی اس نے حفاظت کا بندوبست کیا ہو۔ ﴿لَهُ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ﴾ (الرعد:11) "ہر ایک پر نگران ہیں اس کے آگے اور پیچھے اور وہ اس کی حفاظت کرتے ہیں" (جب تک موت کا وقت نہ آ جائے کچھ نہیں ہوتا) اور جب آ جائے تو فرمایا ﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ﴾ (النساء:78) "(اے موت سے فرار چاہنے والو!) تم کہیں رہو' موت تو تمہیں آ کر رہے گی خواہ بڑے بڑے محفوظ محلوں میں رہو۔"

یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ اس دنیا میں اللہ نے جس شخص کو جہاں اور جن حالات میں پیدا کیا ہے اس میں اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے' بلکہ یہ تو وہبی [3] ہے لیکن

(۱) بے فائدہ (۲) آسان (۳) قدرت کا عطا کردہ

پھر اس دنیا میں اپنے مالک کو پہچان کر اور اس زندگی کی حقیقت کو جان کر اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق ادا کرنے میں اس کے لیے کامیابی ہے اور یہ امتحانی وقفہ غفلت اور مالک کی نافرمانی میں گزار دینے کا نتیجہ نامرادی[1] ہے۔ جان لیجیے کہ انسان اس دنیا میں ان سے بھی یہی کچھ چاہتا ہے جن کا اسے مالک مجازی[2] بنا دیا گیا ہے۔ سورۂ یٰسٓ میں فرمایا گیا:

﴿اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ﴾ (یٰسٓ:71)

"کیا یہ دیکھتے نہیں کہ ہم نے ان کے لیے چوپائے پیدا کیے ہیں اور ان کو ان کی ملکیت میں دے دیا ہے۔"

یہاں تھوڑا سا رک کر سوچیے کہ کیا واقعی ہم نے قرآنِ مجید کو غور و فکر کے لیے اور سوچ سمجھ کر پڑھنے کے لیے مانا ہوا ہے یا پھر صرف ثواب کا ذریعہ بغیر سوچے سمجھے پڑھ کر۔ اور بُرا نہ مانیئے' اب تو قرآنِ مجید ثواب کے لیے نہیں بلکہ ایصالِ ثواب کے لیے رہ گیا ہے حالانکہ یہ تو زندوں کو رہنمائی دینے اور آگاہ کرنے کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سے پہلی آیت میں فرمایا کہ یہ قرآن ہم نے اس لیے آپ ﷺ پر نازل کیا ہے کہ ﴿لِیُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَیًّا وَّیَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ﴾ (یٰسٓ:70) آپ ﷺ آگاہ کر دیں ان کو جو زندہ ہیں اور کافروں پر حجت[3] قائم ہو جائے اور وہ قیامت کے دن کوئی عذر نہ پیش کر سکیں کہ ہمیں معلوم نہ ہوا کہ زندگی کیسے گزارنا تھی۔ اب غور کیجیے اس پر کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں ذرا سوچو! ہم نے چوپایوں کو پیدا کر کے تمہاری ملکیت میں دے دیا ہے۔ جس شخص نے کوئی جانور گھر میں رکھا ہوا ہو تو وہ حقیقتاً خود کو اس کا مالک گردانتا ہے۔ چنانچہ کبھی اس سے پوچھیے کہ یہ جانور کس کا ہے' تو وہ فوراً کہے گا یہ میرا ہے یعنی اس کا مالک میں ہوں۔ چنانچہ وہ اس جانور کے لیے خوراک مہیا کرنے اور

(۱) محرُومی (۲) غیر حقیقی (۳) دلیل

اس کی حفاظت کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اور اس ذمہ داری کو نبھاتا بھی ہے۔ لیکن اس جانور کی پرورش اور حفاظت کا سامان کرنے کے بعد وہ اس پر اپنا یہ حق سمجھتا ہے کہ وہ جانور اپنے مالک کی فرمانبرداری کرے۔ اگر وہ جانور مالک کی مرضی پر نہ چلے تو اسے غصہ آتا ہے اور وہ جانور کو سزا دینے سے بھی نہیں چوکتا۔ ایسا اس لیے ہے کہ وہ اسے مالک کا حق سمجھتا ہے کہ اس کا غلام اس کا فرمانبردار ہو اور وہ حق بندگی ادا کرے۔ چنانچہ یہی وہ مطالبہ ہے جو مالکِ کائنات ہر انسان کے سامنے قرآن مجید میں رکھتا ہے جیسے فرمایا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ﴿اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ﴾ (آل عمران:51) "اے لوگو! بے شک اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی' پس بندگی اسی کی کرو' اور یہی سیدھا راستہ ہے۔"

اب جان لیجیے بندگی کیا ہے! عبادت دو چیزوں کا مجموعہ ہے (محبت + اطاعت) یعنی مالک کو رب مان کر اس کی اطاعت' دل کی آمادگی کے ساتھ۔ گویا جس کے لیے انتہا درجے کی محبت ہو اور اس کی اطاعت کے تحت باقی سب فرمانبرداریاں ہوں وہ آپ کا رب ہے۔ جیسے فرمایا گیا سورہ توبہ میں:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِیْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ﴾ (التوبہ:24)

"فرما دیجیے اگر تمہارے آباء و اجداد' تمہاری اولاد' تمہارے بہن بھائی' تمہاری بیویاں' تمہارے رشتے دار اور وہ مال جو جمع کرتے ہو' وہ تجارت جس کے مندے[1] کا ڈر رہتا ہے اور وہ رہائش گاہیں جو تمہیں بہت بھلی لگتی

(۱) خسارہ

ہیں زیادہ محبوب ہیں اللہ' اس کے رسول ﷺ اور اس کی راہ میں جہاد سے تو انتظار کرو (سزا کا) یہاں تک کہ اللہ فیصلہ فرما دے اور اللہ ایسی نافرمان قوم کو راہ یاب نہیں کرتا۔"

اور جیسے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے:

((لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ)) (سنن ابی داؤد)

"کسی مخلوق کی فرمانبرداری جائز نہیں جس میں خالق کی نافرمانی آتی ہے۔"

یعنی باقی سب اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع[1] ہوں۔

یہ بھی یاد رہے کہ اللہ پوری زندگی کا مالک ہے اس لیے وہ بندگی بھی پوری زندگی کی چاہتا ہے اور یہ اس کا حق ہے رب ہونے کے ناتے سے' جیسے تم اپنا حق سمجھتے ہو چوپایوں پر کہ وہ تمہاری اطاعت کریں اور وہ کام تمہاری مرضی کے مطابق کریں جن کے لیے تم نے ان کو پال رکھا ہے۔

اب آیئے اس دور کے اس مغالطے[2] کی طرف کہ جس کی وجہ سے ہماری زندگیاں دورنگی کا شکار ہیں کہ ہم اللہ کو رب مانتے ہوئے بھی اس کی فرمانبرداری نہیں کر رہے اور اس کی عبادت کا پورا حق ادا نہیں کر رہے۔ پہلے تو لیجیے ان انسانوں کا معاملہ جو زبان سے تو اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے' لیکن ان کی زندگیوں میں اس کی شہادت[3] نہیں ملتی کہ وہ واقعی اللہ کے بندے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں تو صد فی صد یہی بات سچی ہے کہ ان کا اللہ کے رازق اور محافظ ہونے پر بالکل یقین نہیں ہے بلکہ وہ درحقیقت وسائل و ذرائع ہی کو روزی رساں مانتے ہیں' یا اللہ کے سوا کچھ دوسری ہستیاں ہیں جن کے متعلق انہیں گمان ہے کہ ان کے قبضۂ قدرت میں نفع و نقصان کا اختیار ہے۔

کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے اپنے ذریعۂ معاش کو ہی اپنا رازق و محافظ سمجھ رکھا ہے'

(۱) ماتحت (۲) دھوکا (۳) گواہی

اس کے لیے وہ بڑی چاہت کے ساتھ اس کی بندگی کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ وہ اپنا وقت اور اپنی صلاحیتیں بھرپور طریقے پر اس کے لیے نچھاور کرتے ہیں۔ باقی رہا نماز روزہ' تو بس ایک رسم کے طور پر کبھی کبھار ادا کر لیتے ہیں وگرنہ اللہ کے رب ہونے پر ان کو فی الواقع یقین کی کیفیت حاصل نہیں۔ اگر یہ یقین ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ وہ مالک کی رضا یا ناراضگی کا خیال کیے بغیر اپنی روزی کی معاملے میں تو اپنا سب کچھ کھپا دیں لیکن اللہ کی فرمانبرداری کے بارے میں انہیں کبھی خیال تک نہ آئے۔ انہیں احساس ہی نہ ہو کہ مالکِ حقیقی نے کن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اور کن کو حلال' کن برائیوں سے منع کیا ہے اور کن فرائض کا پابند کیا ہے' کن عبادات کو لازم کیا ہے اور کن لغویات[1] سے روکا ہے۔ اگر انہیں اللہ کے رب ہونے کا یقین ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ ان کو اللہ کی پکار پر لبیک کہنے کی توفیق نہ ہو لیکن دکان وقت پر ضرور کھولیں' انہیں اللہ کی ناراضگی کا ڈر نہ ہو لیکن اپنے دفتر کے انچارج یا فیکٹری کے مالک کے بے دام غلام ہوں' انہیں اللہ کی رضا کا خیال نہ آئے لیکن وہ جسے اپنا رازق سمجھے بیٹھے ہیں اس کی چشم و ابرُو کے اشاروں[2] کو بھی پہچانیں اور اس کی خوشنُودی کا کوئی موقع ضائع نہ جانے دیں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

"جس نے صبح نماز سے شروع کی (اور پھر باقی کام کیے) تو اس نے ایمان کے جھنڈے تلے صبح کی اور جس نے صبح بازار کے کام کاج سے شروع کی (بغیر نماز پڑھے) تو اس نے شیطان کے جھنڈے تلے صبح کی۔"

(ابنِ ماجه)

میں اپنی بات کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں جس کا بہت سے لوگوں کو تجربہ ہوا ہو گا۔ چند حضرات کہیں محفل میں بیٹھے ہوں اور اذان کی آواز آ جائے اور ان میں سے کچھ مسجد کے لیے اٹھیں اور دعوت دیں کہ نماز کے لیے چلیں تو باقی حضرات کی زبان پر یہ

(۱) بے ہودہ کام (۲) معمولی اشاروں

الفاظ آ جائیں گے کہ ہمارے لیے بھی دعا کرنا کہ ہم بھی نمازی ہو جائیں' لیکن یہی لوگ صبح کو کسی سے نہیں کہتے کہ دُعا کرنا کہ میں دفتر چلا جاؤں یا دکان کھول لوں بلکہ وہاں خود جاتے ہیں۔ ان کو اللہ کے رازق ہونے پر یقین نہیں ہے' اس کے لیے اس کے دَر[1] پر کیوں جائیں؟ جہاں سے رزق حاصل ہونے کا یقین ہے وہیں تو جائیں گے! یہ ہے اصل معاملہ کہ ان کی اپنی فطرت انہیں مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنے اس "رب" کی فرمانبرداری کے تقاضے پورے کریں جسے وہ اپنا رازق سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے دل میں اصل مالک اور رازقِ حقیقی اللہ تبارک و تعالیٰ کے در پر جانے کے لیے آمادگی[2] نہیں ہے کیونکہ اسے وہ مالک اور رازق مانتے ہی نہیں۔

اب دوسرے لوگوں کا جائزہ لیجیے۔ یہ وہ ہیں جن کو یقین ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا بھی ایسی برگزیدہ ہستیاں ہیں جن کی خوشنودی حاصل کرنا اور جن کی اطاعت کرنا عبادت ہے' اس کے لیے کہ ان کے نزدیک ان ہستیوں کے ہاتھ میں رزق اور نفع و ضرر کا اختیار ہے۔ یہ لوگ بھی اپنے ان باطل ارباب کی عبادت کا حق ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے' لیکن کائنات کے اصل مالک کی انہیں ذرا بھی پروا نہیں ہے' اس لیے کہ وہ اپنا رب ان ہی ہستیوں کو قرار دے چکے ہیں۔ دیکھ لیجیے کہ بزرگوں کے مزارات پر حاضری میں کبھی کوتاہی نہیں ہوگی' ان کے عرس کے مواقع پر خالص اشیاءِ نذرانہ کے طور پیش ہوں گی' لیکن باقی پُورا سال اللہ کے مقرر کردہ حرام و حلال کی نہ پرواہ کی جائے گی اور نہ ہی اس کے آگے سربہ سجود ہونے کی۔ وہ زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے' غریبوں اور مسکینوں کی بدحالی پر کبھی ان کا دل نہیں پسیجے[3] گا' رشوت خوری یا ملاوٹ' اور ناجائز منافع خوری کی انہیں کبھی پروا نہیں ہوگی' اس کے لیے کہ یہ چیزیں تو اُس اللہ نے حرام قرار دی ہیں جس کی نافرمانی کا انہیں کوئی خوف نہیں ہے۔

اب آیئے تیسرے طبقہ کی طرف! یہ وہ لوگ ہیں جو واقعی اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا ربّ

(۱) دروازہ (۲) رضامندی (۳) نرم پڑنا

مانتے ہیں لیکن ان کے ہاں عبادت کا تصور یا تو محدود ہو گیا ہے یا مسخ شدہ ہے۔ ان لوگوں نے مراسمِ عبودیت اور اسلام کے ارکان ہی کو پوری عبادت سمجھ لیا ہے۔ باقی رہے تمدُّن' معاشرت' معیشت اور سیاست کے معاملات تو یہ ان کی نظر میں عوام کے دنیاوی معاملات ہیں' جن کا عبادت سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمارے مذہبی طبقات جو مختلف مسالِک سے وابستہ ہیں' اکثر و بیشتر اسی نظریہ کے حامل ہیں۔ اگرچہ زبانی طور پر تو وہ کہتے ہیں کہ دین زندگی کے تمام معاملات میں رہنمائی دیتا ہے لیکن عبادت کے لفظ کو انہوں نے صرف ارکانِ اسلام کے لیے خاص کر لیا ہے۔ اس دائرے میں وہ ذرا سی کوتاہی یا اختلاف کو برداشت کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں' لیکن زندگی کے باقی تمام معاملات میں ہر کسی سے اتحاد کرنے پر تیار ہوتے ہیں' خواہ وہ اسلام کو بطورِ دین مانے یا نہ مانے۔ گویا انہوں نے اسلام کو محض ایک مذہب کا درجہ دے کر اسے ہی کل دین سمجھ لیا ہے۔ ان کی مساجد' طریقۂ نماز' مسائل روزہ و زکوٰۃ و حج تو مختلف ہیں لیکن طرزِ معاشرت' کاروبار اور طریقِ سیاست سب ایک جیسے ہیں' اور ان معاملات میں ان کا طرزِ عمل بالعموم اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ ان کی تبلیغ اور بحث و مباحثے کی حدود بس مراسمِ عبودیت تک محدود ہیں۔ باقی رہا نظامِ معاشرت و معیشت و سیاست تو خواہ مشرکانہ یا ملحدانہ ہو انہیں اس کی اتنی تشویش نہیں ہے جتنی اپنے مسالِک میں اختلاف کی۔ ان کے مدرسوں اور مساجد پر حکومت کنٹرول کرنے کی کوشش کرے تو مرنے مارنے پر تیار ہوں گے لیکن طرزِ حکومت مغربی جمہوریت پر مبنی ہو' معیشت سودی نظام پر مبنی ہو' معاشرے میں بے حیائی اور بے حجابی[1] کا دور دورہ ہو تو انہیں کوئی پرواہ نہیں کہ ان کو بدلنے کے لیے کوئی جدوجہد کی جائے۔ وہ بس اپنے مسلک کے مطابق عقیدہ رکھ کر اور عبادات ادا کر کے گویا پورا حق بندگی ادا کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے گرد ایسے دائرے کھینچ لیے ہیں کہ ان کے قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔ ان دائروں کے قیدی سوچنے سمجھنے کے لیے آزاد

(۱) بے پردگی

نہیں بلکہ عوام کو بھی مسلکی تعصُّب [1] میں جکڑ رکھا ہے، یہ اصل میں اُمت کو تقسیم کرنے اور ایک دوسرے سے لاتعلق کرنے کا عمل ہے۔ جو چیز جان پہچان کے لیے بنائی تھی اسے فاصلے پیدا ہونے کی بنیاد بنالیا ہے۔ ایک ہی کشتی کے مسافر ایک ہی ساحل کے مسافر ہوتے ہیں۔ یہ زاویۂ نظر مفقُود [2] ہے اور مذہب جو دین کے اندر ہے اس کی بنیاد پر ایک دوسرے سے دشمنی مول لے رکھی ہے حالانکہ طاغوت ان کو ایک سمجھتا ہے۔ جان لیجیے کہ مراسمِ عبُودِیَت ارکان یا ستون ہیں جن پر اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہے لیکن یہ ستون بجائے خود عمارت نہیں ہیں۔ اسلام کی عمارت تو اصل میں پوری زندگی میں اللہ کو رب مان کر اس کی فرمانبرداری اور اطاعت کا نام ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذاریات:56) "اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔" اگر نماز روزہ کو بندگی مان لیا جائے تو پھر تو انسان کو ہر وقت نماز روزہ سے ہی ہونا چاہیے کیونکہ پیدا ہی اس لیے کیا ہے۔ لیکن بندگی اصل میں اس کو رب مان کر پوری زندگی اس کی اطاعت کرنا ہے' دل کی آمادگی سے۔ انسان کس کی بندگی کرتا ہے؟ اپنے مالک کی یا اپنے نفس کی' برادری کی' اصولِ تجارت کی اور مادر پدر آزاد [3] جمہورِیَت کی یا اپنے رب کی۔ اس بات کا اصل ٹیسٹ تو ہوتا ہی زندگی کے اجتماعی معاملات میں ہے کہ انسان کس کا بندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس لیے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً﴾ (البقرہ:208)

"اے ایمان والو! اسلام (یعنی اللہ کی فرمانبرداری) میں پورے کے پورے داخل ہو۔"

اور فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ

(۱) جانبداری (۲) غائب (۳) ہر قسم کی مذہبی اور اخلاقی پابندیوں سے آزاد

مُّسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران:102)

"اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے اور تم کو ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔"

پوری زندگی کی روش اس کی فرمانبرداری پر ہو۔ رہن سہن' کاروبار اور دستورِ ریاست اس کی اطاعت پر ہو۔ بقول اقبال مرحوم "چُومی گویم مسلمانم بہ لرزم' کہ دانم مشکلاتِ لا الہ را" [1]۔ یہ مکمل سپردگی (اسلام)' نافرمانی سے بچنا' تقویٰ' پوری فرمانبرداری (اطاعت) بندگی رب ہی کی مترادف اصطلاحات ہیں۔ معاشرتی زندگی میں جب معاملہ آتا ہے رسُومات کی ادائیگی کا تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان اللہ کو محافظ سمجھتا ہے اور انہی رسُومات پر اکتفا کرتا ہے جو اللہ کے رسول ﷺ کی سنت ہیں یا پھر برادری کی ناراضگی کے ڈر سے غلط رسُومات کو ادا کرتا ہے کہ اگر رشتہ دار ناراض ہو گئے تو زندگی گزارنا مشکل ہوگا۔ اسی طرح معیشت میں اگر حرام ذرائع استعمال کرتا ہے اور حرام کھاتا ہے تو وہ رازق کس کو سمجھتا ہے' اللہ کو یا ان ذرائع و اسباب کو؟ پھر اپنے تنازعات اور حدودُ اللہ میں وہ کس کو حَکَم [2] مانتا ہے اور کس کے فیصلے کی پابندی کرتا ہے!

ارکانِ اسلام تو اصل میں انسان کے نفس کی تربیت کا ذریعہ ہیں کہ اس کا تعلق اپنے مالک سے قائم رہے اور اس پر نسیان [3] طاری نہ ہو جس کی بہترین صورت نماز ہے' اور اپنے نفس کی خواہشات کا بندہ نہ بنے جس کے لیے روزہ ہے' اور مال کی محبت اسے حرام میں نہ لے جائے جس کے لیے زکوٰۃ و صدقات ہیں' اور وطن کی محبت اسے علیحدہ عصبیت پر نہ لے آئے جس کے لیے حج و عمرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات کو انسان کے لیے پیدا کیا ہے تاکہ وہ ان تمام اشیاء کو کام میں لائے لیکن اس کی بندگی میں رہ کر یعنی اس کا ایمان و عقیدہ' اس کے مراسمِ عبودیت'

(۱) جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو میں لرز جاتا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کہنے سے کیا لازم آتا ہے۔ (۲) منصف (۳) بھول جانا

رسومات، طرزِ معاشرت، کاروبار و معاش اور سیاست اللہ کے عطا کردہ نظامِ عدل وقسط کے تقاضوں کے تحت ہوں، اور وہ پوری زندگی میں اسی کو رب مان کر اس کی اطاعت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں جہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نویدِ خلافت[1] دی ہے وہاں اس خلافت کی اصل غرض وغایت بھی اس عبادت کو قرار دیا ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (النور:55)

"اللہ تعالیٰ کا تم میں سے ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کر دینے والوں سے وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین میں لازماً خلافت عطا کرے گا، جیسے اس نے خلافت عطا کی ان سے پہلوں کو اور وہ ان کے اس دین (اسلام) کو غلبہ عطا کرے گا جو اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے، اور ان کے خوف کو امن میں بدل دے گا تاکہ وہ میری ہی بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں اور جو اس کے بعد بھی کفر کریں تو وہی نافرمان ہیں۔"

اللہ تعالیٰ اسی مقصد کے لیے اپنے رسولوں کو مبعوث فرماتا رہا ہے کہ وہ اس نظامِ عدلِ اجتماعی کو قائم کریں جس کی بدولت اللہ کی فرمانبرداری کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ یہ ہے وہ حق مالکِ ارض وسماء کا جو بحیثیت انسان ہم میں سے ہر ایک پر عائد[2] ہوتا ہے۔ وہی مالکِ حقیقی ہے اور اسی کے ہاتھ میں ہر جاندار کا رزق اور اس کی زندگی کا اختیار ہے، اور یہی فرمانِ نبوی ﷺ ہے کہ اللہ کا بندوں پر صرف یہی حق ہے کہ وہ اس کی بندگی کریں اور اس میں کسی کو شریک نہ کریں۔ اگر وہ یہ کر گزریں تو پھر بندوں کا یہ حق

(۱) خلافت کی خوشخبری (۲) لاگو

ہے کہ ان کا رب انہیں عذاب نہ دے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں اس شخص کے بارے میں فرمایا گیا کہ جس نے اپنے نفس کی خواہشات کو اپنا الٰہ بنایا ہوا ہے۔ ﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ۭ﴾ (الفرقان:43)

آپ نے کبھی سوچا کہ انسان اپنی خواہشِ نفس کو نہ سجدہ کرتا ہے نہ رُکوع بلکہ اس کا کہا مانتا ہے۔ ویسے بھی سوچیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے اور اگر نماز، روزہ ہی بندگی ہے تو پھر ہر وقت نماز، روزہ میں رہنا چاہیے تاکہ مقصدِ زندگی پورا ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے! اس نے تمام چیزیں جو زمین پر ہیں انسانوں کے لیے پیدا کی ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ انسان ان کو برتے[1] لیکن میری فرمانبرداری میں رہ کر اور یہی مقصد ہے اس کی پیدائش کا۔ یعنی اپنے حق پر اکتفا[2] کرے اور دوسروں کا حق نہ کھائے، طُغیانی[3] سے بچے اور یہ اسے بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کا حق کیا ہے۔ یہ پیمانہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں رکھ دیا ہے کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے بُرائی کیا ہے اور بھلائی کیا ہے، اس کا حق کیا ہے اور کیا اس کا حق نہیں ہے۔ اس بارے میں تو نبی اکرم ﷺ نے یہاں تک فرما دیا کہ اگر کوئی شخص اچھے طریقہ سے دلائل دے کر مجھ سے اپنے حق میں فیصلہ لے لیتا ہے لیکن اس کا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ چیز اس کی نہیں ہے تو میرا فیصلہ بھی اسے جائز قرار نہیں دے گا اور وہ میرے ہاں سے آگ کا انگارہ لے کر لوٹتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ہمیں واقعی اس کا بندہ بن کر زندگی گزارنے کی توفیق دے اور ساری زندگی کی فرمانبرداری اختیار کر کے حقِ بندگی ادا کرنے کی ہمت دے!

(۱) استعمال کرنا (۲) کافی سمجھنا (۳) حد سے بڑھنا

دینِ اسلام کا ایمان والوں سے مطالبہ

بندۂ مؤمن پر لازم عبادات

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝﴾ (الحج:77 تا78)

چند تمہیدی باتیں

۱) قرآنِ مجید جس ترتیب سے نازل ہوا ہے اس ترتیب سے یہ پہلا خطاب ہے جو اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے کیا گیا اور مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیات دورانِ ہجرت نازل ہوئیں یا ہجرت کے فوراً بعد۔

۲) انفرادی حیثیت میں بندۂ مؤمن کے جو فرائض ہیں ان کو بڑی جامعیّت[1] کے ساتھ مُعیّن کر دیا گیا ہے کہ کم از کم لوازماتِ نجات وفلاح کیا ہیں۔

۳) مسلمانوں کو بحیثیتِ اُمت جو فریضہ سونپا گیا ہے اس کو بھی بیان کر دیا گیا ہے اور اس فریضہ کی ادائیگی کی وجہ سے جو مقام اور فضیلت اس کے حصے میں آئی ہے اس کا واضح طور پر ذکر کر دیا گیا ہے۔

اب پہلی آیت کا ترجمہ پڑھئے۔ "اے ایمان والو! رکوع کرو، سجدہ کرو، اپنے ربّ

(۱) مکمل طور پر

کی عبادت کرو اور بھلائی کے کام کرو تا کہ فلاح پا سکو۔"

سب سے پہلے اس بات کو سمجھ لیجیے جو ہمارے ذہنوں میں سمائی ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہو جانے سے آدمی مسلمان ہو جاتا ہے اور لاشعوری طور پر کلمہ شہادت یاد کر لینے سے ایماندار بن جاتا ہے، اب دیگر فرائض ادا کرنے سے تو درجات میں بلندی ہوگی وگرنہ کامیابی تو اس اقرار کی بنیاد پر یقینی ہے۔ یہی ہے وہ تصور جو اس وقت معاشرے میں راسخ[1] ہے اور جس کی بنیاد پر نوّے فیصد آبادی اسلام کی بنیادی تعلیم نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، حلال رزق، راست بازی اور بنیادی اخلاقیات سے بھی فارغ ہے لیکن خود کو مسلمان گردانتی ہے۔ لیکن اس آیتِ مبارکہ میں تو خطاب ہی ان سے ہے جو اہلِ ایمان ہیں اور پھر ان کو حکم دیا گیا ہے کہ یہ کام کرو گے تو فلاح اور کامیابی حاصل کر پاؤ گے۔

ایمان والوں کو سب سے پہلے جو حکم دیا جا رہا ہے وہ ہے رکوع کرو، سجدہ کرو۔ مراد ہے نماز ادا کرو۔ جان لیجیے جس وقت یہ آیات نازل ہوئی ہیں تو اہلِ ایمان پر صرف نماز فرض ہوئی تھی۔ ابھی نہ روزہ فرض ہوا تھا اور نہ زکوٰۃ و حج۔ اس لیے نماز قائم کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ آج جب ہم اس آیت کا مصداق سمجھیں گے تو وہ یہ ہوگا کہ ارکانِ اسلام یا عبادات کا اِلتزام[2] کرو۔ یہ بات بھی سمجھ لینے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندۂ مومن کے لیے سب سے پہلے ان عبادات کو کیوں لازم کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے اور اسے معلوم ہے کہ انسان کی تخلیق میں کیا کیا ضُعف ہیں اور اسے اپنے نفس کو راہ راست پر رکھنے کے لیے کیا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان عبادات کو بندہ مومن پر لازم کیا ہے اور ان کا التزام لازم قرار دیا ہے تا کہ بندۂ مومن اس قابل ہو سکے کہ وہ اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کر سکے اور واقعی بندگی پر رہ کر زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے۔

(۱) پختہ (۲) لازم کرنا

چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جنت میں رہائش عطا کی اور ان سے ایک درخت کے قریب نہ جانے کا عہد لیا۔ لیکن حضرت آدم علیہ السلام اس عہد کو قائم نہ رکھ سکے اور اس درخت کو چکھ لیا۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں سورہ طٰہٰ میں یوں بیان فرمایا گیا ہے۔

﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾

(طٰہٰ:115)

"اور اس سے پہلے ہم آدم کو ایک حکم دے چکے تھے (ایک عہد لے چکے تھے) تو وہ بھول گئے اور ہم نے اس میں پختگی نہ پائی۔"

اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جب دنیا میں بھیجا تو ان پر ارکان اسلام لازم کر دیے تاکہ پھر ان پر غفلت طاری نہ ہونے پائے۔ چنانچہ نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ ہر اُمت پر مختلف صورتوں میں اللہ کی طرف سے فرض رہی ہیں کیونکہ یہ انسان کی تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہتمام ہے تاکہ اللہ کو ماننے والے غفلت سے بچے رہیں۔

نماز کی اصل غرض و غایت یہی ہے کہ وہ انسان کو غفلت سے بچاتی ہے اور اللہ کی یاد تازہ رکھتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے کہ جب انہیں کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز فرمایا تو سب سے پہلا حکم یہی دیا کہ ﴿اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ (طٰہٰ:14) "(اے موسیٰ!) مَیں ہُوں اللہ! میرے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں۔ پس تمہیں میری بندگی پر زندگی گزارنا ہے اور نماز کو قائم رکھنا میری یاد کے لیے۔" اور اسی طرح سورۃ العنکبوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا:

﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ﴾

(العنکبوت:45)

"جو کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی گئی ہے اسے پڑھا کیجئے اور نماز قائم رکھئے، بے شک نماز بے حیائی اور منکرات سے روک دیتی ہے، اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔"

اسی طرح روزہ کا اصل مقصد بھی تقویٰ کا پیدا کرنا ہے اور نفسانی خواہشات بھوک، شہوت اور کمزوری اور تھکان پر کنٹرول حاصل کرنے کا نام ہی تقویٰ ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی نفس پر حاوی[1] نہ ہو جائے بلکہ روحِ ربّانی اتنی قوی ہو جائے کہ نفس کو قابو میں رکھ سکے۔ اس لیے دن کو بھوک اور شہوت[2] پر قابو پایا جائے اور رات کو اللہ کے کلام سے روح کو قوی کیا جائے تاکہ جس مالک کے حکم سے حلال چھوڑ رکھا ہے اس کی یاد تازہ رہے اور کم از کم حرام سے بچنے کی صلاحیّت پیدا ہو جائے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو روزہ کا حاصل ہیں اس لیے انہی آیات میں یہ بھی آ گیا کہ ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ﴾ (البقرۃ: 186) اور ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (البقرۃ:188) جب روح بیدار ہو اور مالک کی طرف توجہ کرے تو جان لو وہ قریب ہی ہے، نفسانی خواہشات کے پردوں کو ہٹاؤ اور اس سے قرب حاصل کر لو اور دیکھو اصل تقویٰ اللہ کی حرام کی ہوئی صورتوں سے اپنے آپ کو بچانے کا نام ہے۔

زکوٰۃ بھی اصل میں تزکیۂ نفس کا بہت بڑا ذریعہ ہے کہ روزی حلال ذرائع سے حاصل کرو اور اسے اللہ کی عطا سمجھ کر حقوق کی ادائیگی میں لگاؤ اور اس میں سے سائل و محروم کا حق نکالو تاکہ اس کی محبت دل میں پیدا نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اَلصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا دلیل ہے انسان کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کی۔

حج تو بہت ہی جامع رکن ہے جس میں مال کا خرچ، نفس کی مشقت کے علاوہ اسلام کی بنیاد پر تمام مسلمانوں کے ایک اُمت کا فرد ہونے کا احساس اُجاگر رکھنے کا بندوبست

---

(۱) غالب (۲) جنسی خواہش

ہے اور لسانی، قومی، علاقائی، نسلی عصبیتوں سے نکالنے کا ذریعہ ہے۔ گھر بار، کاروبار اور دنیاوی مصروفیتوں سے نکلو اور ایک ہی رنگ میں رنگے جاؤ اور اللہ کے حضور پیش ہو جاؤ تاکہ معلوم ہو کہ ہم سب سے پہلے مسلم ہیں اور پھر ہندوستانی، پاکستانی یا ایرانی وعراقی۔ ان تمام آلائشوں سے بندۂ مومن کو بچانے کے لیے اور اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق مستقل رکھنے کے لیے یہ عبادات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہر بندہ مومن پر فرض کی ہیں تاکہ وہ اصل تقاضے جو اس سے مطلوب ہیں وہ ادا کرنے کے قابل رہے۔

دوسری چیز ان عبادات/ ارکان کے بارے میں ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ دین کے ستون ہیں۔ اگر ستون نہ ہوں تو عمارت کا کوئی تصور نہیں۔ اس لیے آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ مَنْ هَدَمَهَا هَدَمَ الدِّیْنِ)) (مشکوۃ)

"نماز دین کا ستون ہے، جس نے ستون کو گرا دیا اس نے دین کو گرا دیا۔"

واقعی حقیقت یہی ہے کہ کوئی بھی عمارت ہو اس کی چھت تو اس کی دیواروں/ستونوں پر ہی کھڑی ہوتی ہے۔ اگر ستون گر جائیں تو عمارت گر جاتی ہے۔

یہ خناس[1] بھی ذہن سے نکال دینا چاہیے کہ پہلے چھت ڈال لی جائے اور پھر ستون بنا لیے جائیں گے، جیسے آج کل کچھ حضرات کا یہ مؤقف ہے کہ پہلے اسلام کا نظام ربوبیت قائم کرو جبکہ ارکانِ اسلام/ عبادات کی ہیئت[2] اور حیثیت بعد میں مُعیّن کی جائے گی۔

اصل تقاضا کیا ہے؟

اصل تقاضا کیا ہے؟ وہی جو پوری انسانیت سے کیا گیا ہے اور وہ ہے عبادتِ رب۔ اپنے مالک کے غلام بن کر پوری زندگی گزارنا کیونکہ یہ انسان کی غَرَضِ تخلیق ہے۔ اب یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ آج کل بعض علماء نے صرف ان ارکانِ اسلام ہی

(۱) مراد ہے غلط خیال (۲) کیفیت

کو پورا دین اور عبادت قرار دیا ہوا ہے۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تو فرما رہے ہیں کہ ہم نے انسان کو پیدا ہی عبادت کے لیے کیا ہے تو کیا انسان کی غرضِ تخلیق صرف نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی ادائیگی ہی ہے۔ حالانکہ یہ تو صرف غفلت سے بچانے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں، اصل مطالبہ تو اللہ تعالیٰ کو دنیا کا مالک مان کر خود کو اس کی اطاعت میں دینا ہے۔ اگر کوئی بندۂ مؤمن عبادات کو ادا کرتا ہے اور پھر تمام زندگی کے معمولات اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حُدود کے اندر رہ کر گزارتا ہے یعنی اپنے معاشرتی، معاشی اور سیاسی فرائض ادا کر کے زندگی گزار رہا ہے اور صرف اپنے جائز حُقوق پر اکتفا[1] کرتا ہے تو اس کی ساری زندگی عبادت ہے اور یہی مطلوب ہے۔

تیسری ذمہ داری جو عائد کی جا رہی ہے وہ ہے خیر اور بھلائی کا اختیار کرنا۔ یہ بھی بندہ مومن کے لیے ضروری ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ تعالیٰ کو اپنے کنبے میں سے وہی پسندیدہ ہے جو اس کی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے اور ان کی بھلائی اور خیر خواہی کا فکر رکھتا ہے۔ یہ حقیقت ہے جس کو نبی اکرم ﷺ نے اپنے فرمان میں یوں بھی واضح فرمایا ہے: ((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ)) (صحیح بخاری و مسلم) دین تو بس خیر خواہی کا نام ہے، اور اس خیر خواہی میں تمام انسانوں کی خیر خواہی شامل ہے۔

یہ انسان کی حمیت[2] اور غیرت حق کا بھی تقاضا ہے کہ انسان جس چیز کو اپنے لیے بہتر سمجھتا ہے، اسے دوسروں کے لیے بھی پسند کرے اور اس لحاظ سے سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ انسان کو جہنم سے بچایا جائے۔ اس کے لیے اس کو فقر و فاقہ کی کیفیت سے نکالا جائے تاکہ وہ بھی اللہ سے لو لگانے کے قابل ہو سکے جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: "حاجت مندی انسان کو کفر تک لے جاتی ہے۔"[3] اس لیے اللہ تعالیٰ نے ادارۂ خلافت کو لوگوں کی بنیادی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ٹھہرا دیا ہے تاکہ لوگ

(۱) کافی سمجھنا (۲) غیرت (۳) ((کَادَ الْفَقْرُ أَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا))

مایوس ہوکر کفر تک نہ پہنچ جائیں۔

یہ ہیں تین تقاضے/ ذمہ داریاں/ فرائض جن کی ادائیگی ہر بندہ مومن سے مطلوب ہے تاکہ وہ اپنے اللہ کی رضا حاصل کر کے اپنی مراد یعنی آخرت کی سُرخرُوئی[1] تک پہنچ سکے۔

یہی پیغام ہے جو اللہ کا ہر نبی اور رسول اپنی اپنی قوم کو دیتا رہا اور یہی ہے جسے نبی اکرم ﷺ کے ماننے والوں کے سامنے اللہ تعالیٰ نے اپنے پہلے خطاب میں واضح فرما دیا تاکہ ہر بندۂ مومن جان لے کہ اس کا رب اس سے کیا تقاضا رکھتا ہے جس کی ادائیگی پر اس کی فلاح کا دارومدار ہے۔

اب آیئے دوسری آیت کی طرف اور وہ یوں ہے:

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ..﴾

دوسری آیت کے بارے میں بعض باتیں سمجھ لیجیے تاکہ پوری طرح سے حقیقت واضح ہو جائے۔

پہلی آیت میں کامیابی کے لوازمات بیان کر دیے گئے تو اب یہ دوسرا حکم کیوں دیا جا رہا ہے جان لیجیے یہ حکم اس امت کے لیے خاص ہے اور وہ اس وجہ سے کہ اس کے رسول ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کو ختم کر دیا اور رسالت کو دائمی[2] بنا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت کا جو سلسلہ جاری فرمایا تو یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و فضل کا ظہور ہے تمام انسانیت کے لیے۔ اس مرتبہ و مقام کے دو پہلو ہیں۔ ایک ہے نبوت کا پہلو اور دوسرا رسالت۔

نبوّت

نبوّت کی اصل غرض و غایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام کو وصول کرنے کی صلاحیت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا تھا کہ میری طرف سے ہدایت آتی رہے

(۱) کامیابی (۲) سدا کا، ابدی

گی، اس کی صورت یہ اختیار کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے ان انسانوں کو چنا جن میں اللہ کے کلام کو وصول کرنے کی صلاحیت تھی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ (آل عمران:33)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا آدم علیہ السلام، نوح علیہ السلام، آلِ ابراہیم علیہ السلام اور آلِ عمران کو تمام جہانوں میں سے۔"

یہ ہیں اللہ تعالیٰ کے انبیاء علیہم السلام جو ہدایت کو وصول کرتے رہے۔ ان میں سے کچھ وہ تھے جن کو پھر اللہ تعالیٰ نے بعض قوموں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ ہر نبی چونکہ اللہ کا بندہ اور انسان تھا اس لیے یہ پیغام اس کے لیے بھی تھا۔ یہ ہدایت کا سلسلہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے شروع کیا تھا اور پھر وقتاً فوقتاً جاری رہا یہاں تک کہ نبی آخرالزمان حضرت محمد ﷺ پر اس ہدایت کو کامل کر دیا۔ ایک مکمل ضابطۂ حیات دے دیا گیا اور پھر اس ہدایت کو رہتی دنیا تک کے لیے محفوظ فرما دیا۔ اس پر یہ سلسلہ ختم ہو گیا کیونکہ اب مزید ہدایت کا نازل کرنا مطلوب نہ تھا۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ آخری نبی قرار پائے۔ یہ ہے اصل محمد المصطفیٰ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری چنیدہ[1] انسان جن کو نبی کے طور پر اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا اور ان کو اپنے آخری کلام سے نوازا۔

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ:3)

"آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت پوری کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو بطور ضابطہ حیات پسند کر لیا ہے۔"

(۱) چُنا ہوا

اب اگر کوئی انسان یہ مانتا ہے کہ قرآن مجید الہدیٰ ہے اور وہ اسی طرح آج بھی محفوظ ہے جیسے نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوا تو اس کے پاس نبوت کے لیے جواز[1] نہیں ہے۔

رسالت

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ ان انبیاء میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ نے رسالت کے منصب پر بھی فائز کیا اور مختلف اوقات میں مختلف قوموں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ ان کی ذمہ داری یہ قرار پائی کہ وہ خود جس ہدایت پر ایمان لائے ہیں اور جس پر عمل پیرا ہیں اسے اپنی قوم تک بھی پہنچائیں تاکہ انسانوں کے پاس قیامت کے دن کوئی عذر نہ رہ جائے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کے لیے کہ وہ کیوں اللہ کی بندگی نہ کر پائے۔ چنانچہ سب رسول اس اعلان اور دعویٰ کے ساتھ ہدایت پہنچاتے رہے:

﴿اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ[2] ——— وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ[3]﴾

"میں پہلا مؤمن ہوں اور پہلا اس پر عمل کرنے والا ہوں۔"

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴾ (النساء:165)

"رسول بھیجے گئے مُبشِّر اور مُنذِر بنا کر تاکہ انسانوں کے پاس کوئی عذر نہ رہ جائے اللہ کی جناب میں پیش کرنے کے لیے، اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا۔"

نبی اکرم ﷺ سے پہلے جتنے بھی رسول مبعوث ہوئے ہیں وہ اپنے اپنے زمانے میں خاص لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے اس لیے ان کو وہ کتب عطا کی گئیں جو اسی زمانے کے لیے تھیں اور انہی لوگوں کے لیے ہدایت تھیں۔ اس لیے ہر رسول بنفسِ نفیس اس پیغام پر عمل کر کے بھی دکھا دیتے تھے اور قوم تک بھی پہنچا دیتے تھے اور حجت قائم کر دیتے تھے۔

(۱) قانونی اجازت، جائز ہونا (۲) الاعراف:143 (۳) الانعام:163

انہیں معنوں میں ہر رسول اپنی قوم کے لیے شاہد بنے جو اس دنیا میں شہادت کا فریضہ ادا کرتے رہے اور قیامت کے دن اپنی اپنی قوم/امت پر گواہ ہوں گے۔

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰي هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا﴾ (النساء:41)

"کیسا سماں ہوگا (قیامت کے دن) جب ہم ہر امت پر ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپ ﷺ کو اے رسول ان پر گواہ لائیں گے۔"

یہی مضمون ہے جو سورۃ الاعراف کے شروع میں دہرایا گیا ہے: ﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ (الاعراف:6) "اور ہم لازماً پوچھیں گے ان سے جن کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور ان سے بھی جنھیں رسول بنا کر بھیجا۔" یعنی یہی گواہی ہے جو رسولوں سے لی جائے گی کہ انہوں نے اللہ کا پیغام اُمت تک پہنچا دیا تھا اور جب وہ گواہی دے دیں گے تو پھر امت جواب دہ ہوگی اس پر عمل کی اور یہ ہے وہ قطعِ عذر جس کے لیے اللہ تعالیٰ رسولوں کو مبعوث فرماتے رہے ہیں جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا معاملہ خصوصیت کا حامل ہے کیونکہ ان کو جو ہدایت دی گئی وہ نہ صرف الہُدیٰ ہے بلکہ دائمی، جامع، ہمہ گیر، آفاقی اور دوامی بھی ہے۔ وہ صرف اس زمانے کے لیے نہیں بلکہ رہتی دنیا تک کے لیے ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لے لیا۔ اب اس ہدایت کو بنی نوع انسان تک پہنچانے کی ذمہ داری کے لیے جو انتظام اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے پسند فرمایا وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کے ذریعہ یہ پیغام ایک اُمت تک پہنچا دیا اور پھر اس اُمت کے ذمہ لگایا کہ وہ اپنے اپنے دور کے لوگوں تک پہنچائے اور اس ذمہ داری کے لیے فرمایا: ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾ (الحج:78) کہ اے امت مسلمہ اب تمہیں اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے جیسے جہاد کا حق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں منتخب (Select) کر لیا ہے

اور یہی وہ لفظ ہے جو منصبِ رسالت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے لیے پسند فرمایا اور آپ ﷺ کو احمد المجتبیٰ بنایا اور یہی نام ہے جو پہلی کتابوں میں آپ ﷺ کے لیے آیا ہے' کیونکہ فریضۂ رسالت ہے جس کا حق واقعی انسانی جدوجہد کے ذریعہ آپ ﷺ نے ادا کیا اور امت کے لیے نمونہ چھوڑا۔

چنانچہ ختم نبوت کی خلعتِ فاخرہ[1] آپ ﷺ کے سر سجی اور تکمیلِ رسالت کی ذمہ داری آپ ﷺ کی اُمت کو تفویض ہوئی۔[2]

(۱) باعثِ فخر عطیہ (۲) حوالے ہونا

مقام وفضیلتِ اُمّت

جان لیجیے یہ فریضہ شہادت ہی ہے جس کی ذمہ داری اس امت پر ڈالی گئی اور اس ذمہ داری کی وجہ سے انہیں بھی مجتبیٰ کہا گیا اور یہی سبب ہے جس کے لیے اسے امتِ وَسَط کے منصب کا حقدار ٹھہرایا گیا۔

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرۃ:143)

"اور اسی لیے ہم نے تمہیں امتِ وَسط بنایا ہے تاکہ تم گواہ بن جاؤ انسانوں پر جیسے رسول گواہ بنے تم پر۔"

وسط کیا ہے؟ اصل میں یہ امت اللہ تعالیٰ کے سلسلۂ پیغام رسانی کی زنجیر کی ایک کڑی قرار پا گئی۔ اللہ کا پیغام انسانوں تک پہنچانے کے لیے پہلے یہ سلسلہ اس طرح مکمل ہو جاتا تھا کہ اللہ کا پیغام لاتا تھا رسولِ مَلَک یعنی فرشتۂ رسول اور وہ پہنچا دیتا تھا النّاس میں سے رسول تک اور وہ پہنچا دیتا تھا اپنی قوم تک' لیکن نبی اکرم ﷺ پر آ کر یہ روایت[1] تبدیل کر دی گئی۔ اب یہ کام اس اُمت نے کرنا ہے' گویا قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے یہی اُمّت "واسطۂ ہدایت" اور "ذریعۂ نجات" ہے۔ اور یہی اس کا مقامِ فضیلت ہے کہ جس کی بِناء پر پہلے رسولؑ بھی اس امّت میں ہونے کی خواہش کرتے رہے اور اس ذمہ داری کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو جو یہ کام سرانجام دیں گے' اپنا بھائی قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

يٰلَيْتَنِيْ لَقِيْتُ اِخْوَانِيْ قَالُوْا اَلَسْنَا اِخْوَانَكَ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ قَوْمٌ يَّجِيْئُوْنَ بَعْدَكُمْ يُؤْمِنُوْنَ بِيْ اِيْمَانَكُمْ وَيُصَدِّقُوْنِيْ

(۱) طور طریقہ

تَصْدِيْقَكُمْ وَيَنْصُرُوْنِيْ نَصَرَكُمْ فَيَالَيْتَنِيْ لَقِيْتُ اِخْوَانِيْ

(ابن ابی شیبہ فی مسندہ)

"حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کاش میری ملاقات ہوا اپنے بھائیوں سے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: کیا ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھائی نہیں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیوں نہیں لیکن میری مراد ان سے ہے جو تمہارے بعد آئیں گے۔ وہ مجھ پر ایمان لائیں گے جیسے تم ایمان لائے ہو۔ وہ میری تصدیق کریں گے جیسے تم نے کی ہے اور وہ میری مدد کریں گے جیسے تم کر رہے ہو۔ پس کاش میری ملاقات ہوا اپنے بھائیوں سے۔"

کیسا خوشی کا مقام ہے اس شخص کے لیے جو ایمان رکھتا ہو اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کرے کہ وہ واقعی اللہ کے آخری رسول ہیں جن کو تمام انسانیت کے لیے بھیجا گیا ہے اور پھر ان کے مشن میں ان کا مددگار بنے اور مرتبۂ اُخوّت[1] حاصل کرے۔ اسی طرح کا وہ فرمان ہے جو امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ:

سَئَلَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ هَلْ مِنْ قَوْمٍ اَعْظَمُ مِنَّآ اَجْرًا اٰمَنَّا بِكَ وَاتَّبَعْنَاكَ قَالَ بَلْ قَوْمٌ يَاْتُوْنَ بَعْدَكُمْ يَاْتِيْهِمْ كِتَابُ اللهِ بَيْنَ لَوْحَيْنِ فَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَعْمَلُوْنَ بِمَا فِيْهِ اُوْلٰٓئِكَ اَعْظَمُ مِنْكُمْ اَجْرًا

"اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرض کی: کیا ہم سے بھی کوئی اجر میں بڑا ہوگا؟ ہم وہ ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کر رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں' وہ لوگ جو تمہارے بعد آئیں گے (جنہوں نے نہ مجھے دیکھا ہوگا اور نہ ہی تم لوگوں کو)۔ ان کے پاس

(۱) بھائی چارے کا مرتبہ، ساتھ دینے کی سعادت

اللہ کی کتاب دوگتّوں کے درمیان پہنچے گی تو وہ اس حال میں بھی مجھ پر ایمان لائیں گے اور جو اس کتاب میں ہوگا' اس پر عمل کریں گے۔ وہ تم لوگوں سے اجر میں بڑھ کر ہوں گے۔"

لیکن یہ فضیلت اور اجر اس ذمہ داری کی بنیاد پر ہے جو آگے بیان ہوئی ہے اور وہ یہ ہے:

﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (الحج:78)

"تاکہ جیسے ہمارے رسول تم پر دین کی گواہی دے رہے ہیں ویسے تم باقی لوگوں کے لیے گواہ بن جاؤ۔"

وگرنہ کسی اُمتی کے گھر پیدا ہو جانے سے یہ فضیلت نہیں ملتی بلکہ ذمہ داری کی امکانی ادائیگی کی وجہ سے فضیلت ملتی ہے جو قرار دی گئی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن میں ان کی مدد' کیونکہ کسی اُمت میں پیدا ہونا کسی کے اختیار سے نہیں ہے کہ اس کو جواز[1] بنا لیا جائے اپنی عظمت کا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے جہاں چاہا کسی کو پیدا کیا ہے۔ اُمتی کی عظمت تو اس میں ہے کہ وہ ذمہ داری جو اس پر اُمتی ہونے کے ناطے سے عائد کی گئی ہے وہ ادا کرے' ورنہ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزِ محشر ان کو اُمتی ہی نہ مانیں جنہوں نے ذمہ داری ادا نہ کی ہو کیونکہ اصل میں تو یہ فریضہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُمتیوں پر عائد کر کے گئے ہیں۔

یاد کیجیے حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطابات اس فریضۂ شہادت کے لیے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُمّت کے سپرد کر کے گئے ہیں جب کہ کوئی سوا لاکھ کے مجمع سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا:

اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ

(۱) جائز ہونا

"لوگو! آ گاہ ہو جاؤ کیا میں نے اللہ کے دین اور اللہ کے پیغام ہدایت کو
آپ لوگوں تک پہنچا دیا ہے۔"

تو لوگوں نے بَیک زبان جواب دیا:

نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ (رواہ مسلم)

"ہم گواہ ہیں کہ آپ ﷺ نے پہنچا بھی دیا' حق امانت بھی ادا کر دیا'
امت کی خیر خواہی کا حق بھی پورا کر دیا۔"

اس پر سید المرسلین ﷺ نے فرمایا تو اب آپ لوگوں کو یہ امانت سونپی جا رہی ہے اور اب تمہیں امتی ہونے کا حق ادا کرنا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمہیں پسند فرمایا ہے:

فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ (متفق علیہ)

"پس جو گواہی دے رہا ہے وہ ان تک پہنچائے جن تک نہیں پہنچا"

اور پھر اس میں ایسی عمومیت پیدا کی کہ ہر امتی یہ جان لے کہ یہ فریضہ ادا کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ فرمایا:

بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً

"پہنچاؤ میری جانب سے (on my behalf) خواہ ایک ہی آیت تم
تک پہنچ پائی ہو۔"

یہ ہے جو ہر اُمتی کو جان لینا چاہیے کہ یہ ذمہ داری صرف علماء کی نہیں ہے بلکہ جو بھی فضیلت حاصل کرنے کا متمنی (۱) ہے اسے یہ ذمہ داری بھی ادا کرنی چاہیے۔ یہ نہیں ہے کہ ہم تو بنیں ڈاکٹر' انجینئر' سائنسدان اور سرمایہ دار اور یہ ذمہ داری ہماری طرف سے ادا کریں مولوی حضرات' کیونکہ ان کو ہم اس ذمہ داری کے عوض چندے دیتے ہیں۔ جان لیجیے یہ کارِ رسالت پوری اُمّت کا اجتماعی فریضہ ہے۔ اس سے عہدہ برآ (۲) اسی طریقے پر

(۱) خواہش مند (۲) ادا کرنا

ہوا جا سکتا ہے جیسے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا۔ وہ اپنی روزی بھی خود کماتے تھے اور یہ فریضہ بھی ادا کرتے تھے۔ اور یہی ہے جو ہر رسول سے بھی کہلوایا گیا: (لَا أَسْئَلُ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ) "میں اس کام کی اُجرت تم سے نہیں مانگتا۔" علماء حضرات کو بھی جان لینا چاہیے کہ درس و تدریس پر تو اُجرت لی جا سکتی ہے لیکن تبلیغِ دین پر اُجرت کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ یہ اُسوہ رُسل (۱) کے خلاف ہے۔

(۱) رسولوں کا طریقہ

مقصدِ بعثتِ انبیاء ورسل

اب سوچنے کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کیسے اپنے رسولوں کے ذریعہ حُجّت [1] قائم کرتا رہا ہے اور ان کو کون سی چیز دے کر بھیجتا رہا ہے کہ جس کی گواہی دے کر وہ قطعِ عذر [2] کرتے تھے۔ سب سے پہلے تو جان لیجیے کہ تمام رسولوں کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید:25)

"بے شک اللہ تعالیٰ بھیجتا رہا ہے اپنے رسولوں کو بینات دے کر اور نازل کرتا رہا ہے ان کے ساتھ کتاب اور میزان تا کہ لوگ عدلِ اجتماعی پر قائم رہیں۔"

اس آیتِ مبارکہ میں تین حقائق بیان ہوئے ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی رہنمائی کا حق بھی ادا کرتا رہا ہے اور حجت بھی قائم کرتا رہا ہے۔

سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس رسول کو بھی کسی قوم/ امت کی طرف بھیجا ہے تو ایسی نشانیاں دے کر بھیجا ہے کہ وہ قوم اور امت اچھی طرح جان لیتی تھی کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ ظاہر ہے اگر قوم پہچانے ہی نہ تو حجت کیسے قائم ہوگی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ایسے معجزات دے کر اپنے رسولوں کو بھیجتا تھا کہ لوگ جان لیتے تھے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ پھر وہ مانتے کیوں نہیں رہے تو جان لیجیے ماننے میں اصل تو رکاوٹ رہی ہے انسانوں کی باطل نظام میں وہ حیثیت جو انہوں نے حاصل کی ہوتی ہے یا مالی مفادات جو اس باطل نظام کے تحت انہیں حاصل ہوتے ہیں اور ان کا یہ زُعم [3] کہ اصل دانش اور بینش [4] کے تو وہی حامل ہیں اور قوم کے اصل خیر خواہ

(۱) دلیل (۲) بہانہ ختم کرنا (۳) گُمان (۴) علم وبصیرت

ہیں۔ حالانکہ وہ قوم کے تمام وسائل پر مسلّط [1] ہوتے ہیں اور بدمعاشی کر رہے ہوتے ہیں۔ جیسے آج بھی آپ اسلام کی دعوت دیں تو سب سے پہلے یہی لوگ آپ کو بتائیں گے کہ وہ ہی اصل عقلمند اور قوم کی ترقی کے گُر جاننے والے ہیں، یہ بنیاد پرست تو قوم کو پیچھے لے جانا چاہتے ہیں اور ان کے نظریات بڑے سطحی ہیں۔ وگرنہ کیا خیال ہے فرعون کو معلوم نہ ہوا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے فرستادہ [2] ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا، جیسے قرآن مجید میں واضح کیا گیا ہے:

﴿قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ﴾ (بنی اسراءیل:102)

"(موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا) اے فرعون! تو اچھی طرح جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نشانیاں نازل کی ہیں وہ تیرے لیے بصیرت کا سامان رکھتی ہیں اصل مالکِ ارض وسماء کی طرف سے"۔

اور فرمایا:

﴿فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٣﴾ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ﴿١٤﴾﴾

(النمل:13 تا14)

"جب ان کے پاس ہماری ایسی نشانیاں آئیں جو روز روشن کی طرح تھیں تو انہوں نے کہہ دیا یہ تو کھُلا جادو ہے اور انکار کیا ان نشانیوں کا ظلم اور سرکشی کرتے ہوئے حالانکہ ان کے دل خوب یقین حاصل کر چکے تھے۔"

کیا خیال ہے اِس امت کا فرعون یعنی ابوجہل کیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کو نہیں جانتا تھا؟ کیوں نہیں۔ اللہ تعالیٰ تو اپنے رسولوں کو ایسے معجزات دے کر بھیجتا ہے اور ان کا کردار ایسا بے مثال ہوتا ہے کہ لوگ پہچان لیں وگرنہ حُجّت قائم نہیں ہوتی۔

(۱) قابض، غالب (۲) بھیجا ہوا

چنانچہ ابوجہل سے کسی نے پوچھا کیا تم جانتے نہیں کہ محمد ﷺ سچے ہیں' تو اس نے جواب دیا اللہ کی قسم انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ پوچھنے والے نے سوال کر دیا کہ پھر تم ان کو مانتے کیوں نہیں۔ اس پر اس نے حق بیان کر دیا کہ اصل معاملہ یہ ہے کہ ہمارے اور بنو ہاشم کے درمیان شریکہ چلا آ رہا ہے اور ہم ان کے مدِّ مقابل[1] ہیں۔ اب اگر آج ان کے نبی کو مان لوں تو ان کے نیچے لگنا پڑتا ہے اور یہ مجھے منظور نہیں ہے۔

یہی صاحبِ اقتدار' جاگیردار' سرمایہ دار اور دنیادار کی سب سے بڑی انانیت[2] ہوتی ہے جو حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے اور آج بھی یہی ہے جو پاکستان کے اقتدار پر براجمان[3] جاگیردار' بیوروکریٹ اور فوجی جرنیلوں کا روگ ہے کہ وہ دین کو اختیار نہیں کر رہے کہ ان کو اس باطل نظام میں جو حیثیت ملی ہوئی ہے اور استحقاق[4] حاصل ہیں ان کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے باطل نظریے اور اپنی بہتری اور دنیا کے ساتھ موافقت رکھنے والی ثقافت کے ختم ہونے کا رونا روتے ہیں اور اہلِ دین کو کم عقل' قدامت پرست' بنیاد پرست کہہ کر ترقی کی راہ میں رکاوٹ قرار دیتے ہیں کیونکہ اگر وہ اسلامی عدل وقسط کے نظام کو رائج کریں تو ان کا یہ مقام نہیں رہتا۔ ان کی عیاشیوں' فحاشیوں اور اباحیت پرستی[5] پر زد پڑتی ہے اور ان کی دنیا کی زندگی برباد ہوتی ہے جبکہ ان کے نزدیک اصل زندگی تو دنیا ہی کی زندگی ہے۔ آخرت کس نے دیکھی ہے اور ویسے بھی وہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے جنت تو ان کا پیدائشی حق ہے ہی۔ اس لیے اپنی دنیا ان دین داروں کے کہنے پر کیوں برباد کریں۔ یہی کہتے رہے ہیں اپنے اپنے وقت کے فرعون' ہامان' نمرود' شدّاد اور مُترفین۔[6] ذرا قرآن مجید میں بیان کردہ حقائق کو تو دیکھیں' سمجھ آ جائے گی۔

قومِ نوح علیہ السلام نے کیا کہا تھا ان کی دعوت کے جواب میں:

﴿فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا

(۱) مخالف (۲) تکبر (۳) زیب وزینت بخشنا (۴) حق حاصل ہونا
(۵) حلال وحرام کی تمیز نہ رکھنا (۶) خوشحال لوگ

مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ﴾

(ھود:27)

"کہنے لگے سردار (حکمران طبقہ) جو اس قوم کے کافر تھے کہ ہم آپؑ کو اپنے جیسا انسان دیکھتے ہیں اور آپؑ کے ساتھی ہمارے معاشرے کے گرے پڑے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور بڑی سطحی رائے کے حامل ہیں۔ آپ کے پاس کوئی جاگیر بھی نہیں ہے بلکہ ہم آپ کو جھوٹا گردانتے[1] ہیں۔"

اور یہی طرزِ عمل تھا قوم عاد کا اور قوم شعیب علیہ السلام کا اور دوسری قوموں کا اور قریش کا:

﴿وَتِلْكَ عَادٌ ۖ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾﴾ (ھود:59 تا60)

"اور یہ (جن کا ذکر ہوا) قوم عاد تھی جنہوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کا کہنا نہ مانا اور تمام تر ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم اور ضدی تھے۔ اور (ان افعال کا نتیجہ یہ ہوا کہ) اس دنیا میں بھی لعنت ان کے ساتھ ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی۔ خوب سن لو قوم عاد نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا۔ خوب سن لو رحمت سے دوری ہوئی (دونوں جہان میں) عاد کو جو کہ ہود (علیہ السلام) کی قوم تھی۔"

﴿قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰۗؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ﴾

(ھود:87)

(۱) بار بار کہنا

"وہ لوگ (یہ تمام نصائح[1] سن کر) کہنے لگے کہ اے شعیب علیہ السلام کیا تمہاری نماز تمہیں یہی سکھاتی ہے کہ ہم ان چیزوں (کی پرستش) کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے بڑے کرتے آئے ہیں یا اس بات کو چھوڑ دیں کہ ہم اپنے مال میں جو چاہیں تصرُّف[2] کریں واقعی آپ ہیں بڑے بُردبار دین پر چلنے والے۔"

﴿قَالُوْا یٰشُعَیْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِیْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْنَا ضَعِیْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَیْنَا بِعَزِیْزٍ ﴿۹۱﴾ قَالَ یٰقَوْمِ اَرَهْطِیْۤ اَعَزُّ عَلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِیًّا ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ﴿۹۲﴾﴾ (ھود:91 تا92)

"وہ لوگ کہنے لگے کہ اے شعیب علیہ السلام بہت سی باتیں تمہاری کہی ہوئی ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم تم کو اپنے (مجمع) میں کمزور دیکھ رہے ہیں اور اگر تمہارے خاندان کا (کہ ہمارے ہم مذہب ہیں ہم کو) پاس نہ ہوتا تو ہم تم کو (کبھی کا) سنگسار کر چکے ہوتے اور ہماری نظر میں تمہاری تو کچھ توقیر[3] ہی نہیں۔ فرمایا (شعیب علیہ السلام نے) اے قوم کیا میرے قبیلے کی زیادہ توقیر ہے اللہ سے اور اس کو تم نے پُشت پیچھے ڈال دیا ہے۔ یقیناً میرا رب تو اُس سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔"

﴿فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِیَّةٍ یَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِی الْاَرْضِ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّنْ اَنْجَیْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَاۤ اُتْرِفُوْا فِیْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿۱۱۶﴾﴾ (ھود:116)

"تو جو اُمتیں تم سے پہلے ہو گزری ہیں ان میں ایسے سمجھدار لوگ نہ ہوئے جو کہ (دوسروں کو) ملک میں فساد (یعنی کفر و شرک) پھیلانے سے منع

(۱) نصیحت کی جمع (۲) خرچ کرنا (۳) عزت

کرتے۔ بجز چند آدمیوں کے کہ جن کو ان میں سے ہم نے (عذاب سے) بچا لیا تھا اور جو لوگ نافرمان تھے وہ جس ناز و نعمت[1] میں تھے اُسی کے پیچھے پڑے رہے اور جرائم کے خوگر ہو گئے۔"

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ ؕ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَرْسَلْنَا فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۙ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ یَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَیَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَىِٕنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ ۙ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾﴾ (المؤمنون:30 تا34)

"اس (واقعہ مذکورہ) میں بہت سی نشانیاں ہیں اور ہم (یہ نشانیاں معلوم کرا کر اپنے بندوں کو) آزماتے ہیں پھر ہم نے قومِ نوح علیہ السلام کے بعد دوسرا گروہ پیدا کیا۔ پھر ہم نے ان میں ایک پیغمبر کو بھیجا جو ان ہی میں کے تھے (ان پیغمبر نے کہا) کہ تم لوگ اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود (حقیقی) نہیں۔ کیا تم (شرک سے) ڈرتے نہیں ہو۔ اور (ان پیغمبر کی یہ بات سن کر) ان کی قوم میں جو رئیس تھے جنہوں نے (خدا اور رسول کے ساتھ) کفر کیا تھا اور آخرت کے آنے کو جھٹلایا تھا اور ہم نے ان کو دنیوی زندگانی میں عیش بھی دیا تھا کہنے لگے کہ یہ تو تمہاری طرح (ایک معمولی) آدمی ہیں۔ (چنانچہ) یہ وہی کھاتے ہیں جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتے ہیں جو تم پیتے ہو اور اگر تم اپنے جیسے ایک (معمولی) آدمی کے کہنے پر چلنے لگو تو بے شک تم (عقل کے) گھاٹے میں ہو۔"

(۱) آرام و آسائش

﴿وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِى الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع﴾ (القصص:57 تا60)

"اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کے ساتھ ہو کر (اس دین کی) ہدایت پر چلنے لگیں تو فی الفور[1] اپنے مقام سے ہٹا دیے جائیں کیا ہم نے ان کو امن وامان والے حرم میں جگہ نہیں دی جہاں ہر قسم کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں، جو ہمارے پاس سے (یعنی ہماری قدرت اور رزاقی سے) کھانے کو ملتے ہیں لیکن ان میں اکثر لوگ (اس کو) نہیں جانتے۔ اور ہم بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کر چکے ہیں جو اپنے سامانِ عیش پر نازاں[2] تھیں (سو دیکھ لو) یہ ان کے گھر (تمہاری آنکھوں کے سامنے پڑے ہیں کہ ان کے بعد آباد ہی نہ ہوئے۔ مگر تھوڑی دیر کے لیے اور آخر کار (ان کے ان سب سامانوں کے) ہم ہی مالک رہے اور آپ کا رب بستیوں کو (اول ہی بار میں) ہلاک نہیں کیا کرتا۔ جب تک کہ ان (بستیوں) کے صدر مقام میں کسی پیغمبر کو بھیج لے کہ وہ ان لوگوں کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائے اور ہم ان بستیوں کو ہلاک نہیں کرتے مگر اس حالت میں کہ وہاں کے باشندے

(۱) فوراً (۲) فخر کرنے والے

بہت ہی ظلم کرنے لگیں اور جو کچھ تم کو دیا دلایا گیا ہے وہ محض (چند روز) دنیوی زندگی کے برتنے کے لیے ہے اور یہیں کی (زیب و) زینت ہے اور جو (اجر وثواب) اللہ کے ہاں ہے وہ بدرجہا اس سے بہتر ہے اور زیادہ (یعنی ہمیشہ) باقی رہنے والا ہے۔ کیا تم لوگ نہیں سمجھتے۔"

اور کہا تھا قومِ فرعون کے سرداروں اور جادوگروں نے:

﴿قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾﴾ (طٰہٰ:63)

"کہنے لگے یہ دو جادوگر ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ جادو کے زور پر تمہیں تمہاری زمین سے نکال دیں، تمہارے مثالی کلچر کو ختم کر دیں۔"

اور فرعون کہنے لگا:

﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِى الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾﴾

(المؤمن:26)

"مجھے اجازت دو میں موسیٰ کو قتل کر دوں اور وہ پکارے اپنے رب کو۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارے نظام کو بدل دے گا اور زمین میں فساد برپا کر دے گا۔"

اور یہی ہے جسے عمومی طور پر تمام رسولوں کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۳۵﴾﴾ (سباء:34 تا35)

"اور ہم نے جب بھی کسی بستی کی طرف رسول بھیجا تو اس بستی کے خوشحال لوگوں (جن کے پاس اقتدار اور مادی وسائل ہوتے ہیں) نے کہا کہ ہم انکار کرتے ہیں اس کا جو آپ لوگوں کو دے کر بھیجا گیا ہے اور ہم زیادہ ہیں

مال اور اولاد میں (یعنی یہ دلیل ہے ہماری شرافت اور بلند مرتبہ ہونے کی)' اور ہم کو عذاب نہیں دیا جائے گا (کیونکہ اس دنیا میں ہماری کسی خوبی کی وجہ سے ہمیں نوازا گیا ہے اور یہی کافی ہے آخرت کی کامیابی کے لیے بھی)۔"

اور یہی ہے طرزِ عمل جو منافقین اور یہود و نصاریٰ نے اختیار کیا.....

جیسے فرمایا سورۂ النساء اور المائدہ میں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَاۗءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۚ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۣ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا ۝ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ

دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۝ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا ۝﴾ (سورۃ النساء: 59 تا 69)

"اے ایمان والو! تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول ﷺ کا کہا مانو اور جو تم میں سے حکمران ہوں پھر اگر کسی امر کا تم باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے حوالہ کر دیا کرو۔ اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو، یہی سب سے بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے خُوشتر(۱) ہے۔ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ ﷺ کی طرف نازل کی گئی اور اس کتاب پر بھی جو آپ ﷺ سے پہلے نازل کی گئی۔ اپنے مقدمے اللہ کے باغیوں کے پاس لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ ان کو حکم ہوا ہے کہ ان کو نہ مانیں اور شیطان ان کو بہکا کر بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اور رسول کی طرف تو آپ ﷺ منافقین کی یہ حالت دیکھیں گے کہ آپ ﷺ سے پہلو تہی(۲) کرتے ہیں کیسی جان کو بنتی ہے جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے، ان کی اس حرکت کی بدولت جو کچھ وہ پہلے کر چکے تھے، یہ پھر آپ ﷺ کے پاس آتے ہیں، خدا کی قسمیں کھاتے ہوئے کہ ہمارا اور کچھ مقصود نہ تھا، سوائے اس کے کہ کوئی بھلائی نکل آوے اور

(۱) زیادہ بہتر (۲) کنارہ کشی

باہم موافقت ہوجائے۔ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے سو آپ ﷺ ان سے تغافُل [1] کرجایا کیجئے اور ان کو نصیحت فرماتے رہئے اور ان سے خاص ان کی ذات کے متعلق بات خوب سمجھا دیجیے اور ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اسی واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ بحکمِ خداوندی ان کی اطاعت کی جائے اور اگر جس وقت اپنا نقصان کر بیٹھتے تھے اس وقت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوجاتے، پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے تو ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحمت کرنے والا پاتے۔ پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایمان دار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ [2] کراویں۔ پھر اس آپ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پُورا پُورا تسلیم کرلیں۔ اور ہم اگر لوگوں پر یہ بات فرض کردیتے کہ تم خودکشی کیا کرو یا اپنے وطن سے بے وطن ہوجایا کرو تو بجُز معدُودے چند لوگوں کے اس حکم کو کوئی بھی نہ بجالاتا۔ اور اگر یہ لوگ جو کچھ ان کو نصیحت کی جاتی ہے اس پر عمل کیا کرتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا اور ایمان کو زیادہ پختہ کرنے والا ہوتا۔ اور اس حالت میں ہم ان کو خاص اپنے پاس سے اجرِ عظیم عنایت فرماتے اور ہم ان کو سیدھا راستہ بتلا دیتے اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔ یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صُلحاء [3] اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔"

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا

(۱) درگزر (۲) فیصلہ (۳) صالح کی جمع = نیک پارسا لوگ

اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَقَفَّيْنَا عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ عَمَّا جَاۗءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾ ۙ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى

اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ
مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ
قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا
دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا
عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا
اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ
حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾﴾ (المائدہ:44 تا53)

"ہم نے توریت نازل فرمائی تھی جس میں ہدایت تھی اور نور تھا انبیاء جو کہ اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے اس کے موافق (۱) یہود کو حکم دیا کرتے تھے اور اہل اللہ اور علماء بھی بوجہ اس کے کہ ان کو اس کتاب اللہ کی نگہداشت کا حکم دیا تھا اور وہ اس کے اقراری ہو گئے تھے سو تم بھی لوگوں سے اندیشہ مت کرو اور مجھ سے ڈرو اور میرے احکام کے بدلے میں متاع قلیل مت لو اور جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے سو ایسے لوگ بالکل کافر ہیں اور ہم نے ان پر اس (تورات) میں یہ بات فرض کی تھی کہ جان بدلے جان کے اور آنکھ بدلے آنکھ کے اور ناک بدلے ناک کے اور کان بدلے کان کے اور دانت بدلے دانت کے اور خاص زخموں کا بھی بدلہ ہے۔ پھر جو شخص اس کو معاف کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہو جاوے گا۔ اور جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے سو ایسے لوگ ہی ظالم ہیں۔ اور ہم نے ان کے پیچھے عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو اس حالت میں بھیجا کہ وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توریت کی تصدیق فرماتے تھے۔ اور ہم نے ان کو انجیل دی جس میں ہدایت تھی اور نور تھا اور وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توریت کی تصدیق کرتی تھی اور وہ سراسر

(۱) مطابق

ہدایت اور نصیحت تھی۔ خدا سے ڈرنے والوں کے لیے اور انجیل والوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس میں نازل فرمایا ہے اس کے موافق حکم کیا کریں اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے تو ایسے لوگ بالکل نافرمانی کرنے والے ہیں اور ہم نے یہ کتاب آپ کے پاس بھیجی ہے جو خود بھی صدق کے ساتھ موصوف ہے اور اس سے پہلے جو کتابیں ہیں ان کی بھی تصدیق کرتی ہے اور ان کتابوں کی محافظ ہے۔ تو ان کے باہمی معاملات میں اسی بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجئے اور جو سچی کتاب آپ کو ملی ہے اس سے دُور ہو کر ان کی خواہشوں پر عملدرآمد نہ کیجئے۔ تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے خاص شریعت اور خاص طریقت تجویز کی تھی۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی اُمت کر دیتے لیکن ایسا نہیں کیا تا کہ جو جو دین تم کو دیا ہے اس میں تم سب کا امتحان فرما دیں۔ تو نیکیوں کی طرف دوڑو۔ تم سب کو خدا ہی کے پاس جانا ہے پھر وہ تم سب کو جتلا دے گا۔ جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔ اور ہم (مکرر) حکم دیتے ہیں کہ آپ ان کے باہمی معاملات میں اس بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجئے اور ان کی خواہشوں پر عملدرآمد نہ کیجئے اور ان سے یعنی ان کی اس بات سے احتیاط رکھئے کہ وہ آپ کو خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے کسی حکم سے بچلا دیں۔ پھر اگر یہ لوگ اعراض کریں تو یہ یقین کر لیجیے کہ بس خدا ہی کو منظور ہے کہ ان کے بعضے جرموں پر ان کو سزا دیں اور زیادہ آدمی تو نافرمان ہی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ پھر کیا زمانہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں اور فیصلہ کرنے میں اللہ سے کون اچھا ہوگا یقین رکھنے والوں کے نزدیک۔ اے ایمان والو تم یہود و نصاریٰ کو دوست مت بنانا وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا بے شک وہ ان ہی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سمجھ نہیں دیتے

ان لوگوں کو جو اپنا نقصان کر رہے ہیں۔ اسی لیے تم ایسے لوگوں کو جن کے دل میں مرض ہے دیکھتے ہو کہ دوڑ دوڑ کر ان میں گھُستے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم کو اندیشہ ہے کہ ہم پر کوئی حادثہ نہ پڑ جائے، سو قریب اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ کامل فتح کا ظہور فرما دے یا کسی اور بات کا خاص اپنی طرف سے، پھر وہ اپنے پوشیدہ دلی خیالات پر نادم[1] ہوں گے۔ اور مسلمان لوگ کہیں گے ارے کیا یہ وہی لوگ ہیں کہ بڑے مبالغہ سے اللہ کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔ کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ان لوگوں کی ساری کارروائیاں غارت گئیں جس سے یہ ناکام رہے۔"

حق کو قبول کرنے میں دنیاوی آسائشیں سب سے بڑی رکاوٹ رہی ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا بہت مشکل ہے۔

اس کیفیت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح فرمایا اپنے فرمان میں:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ فَقَالَ رَجُلٌ اِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ اَنْ يَّكُوْنَ ثَوْبُهٗ حَسَنًا وَنَعْلُهٗ حَسَنَةً قَالَ اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ وَيُحِبُّ الْجَمَالَ. اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ)) (رواہ مسلم)

"جنت میں وہ شخص داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر تکبر ہوا۔ اس پر ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ایک شخص چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کا جوتا خوبصورت ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہرگز نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہیں اور وہ خوبصورتی کو پسند فرماتے ہیں۔ تکبر یہ ہے کہ انسان حق واضح

(۱) شرمندہ

ہونے پر اس کو جھٹلا دے اور انسانوں کو حقیر سمجھے۔"

تو جان لیجیے اللہ تعالیٰ ہر رسول کو ایسی نشانیاں دے کر بھیجتا رہا ہے تاکہ وہ لوگ پہچان لیں جن کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا' اور ان پر حُجّت قائم ہو جائے۔ اب بھی حق بالکل واضح ہے اور اللہ کی کتاب کی صورت میں اسی طرح محفوظ ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔ لیکن اگر آج لوگ نہیں مانتے تو لاعلمی کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے انکار کرتے ہیں اور ان کی انانیت[1] ہی آڑے آتی ہے اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُسوہ کو قبول کرنے اور عام انسان کی سطح پر زندگی گزارنے سے بچنے کے لیے عذر تراشتے ہیں۔

یہاں ایک حقیقت کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ بعض اوقات باطل نظام میں مذہبی طبقہ بھی حق کی مخالفت میں صاحبِ حیثیت لوگوں کو ڈھال مہیا کرتا ہے۔ جیسے آج علماء دین کی اکثریت اسلام کو بس مذہب کی حیثیت میں پیش فرما رہی ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے ہی کا درس دے رہی ہے جبکہ باطل نظام سے کشمکش اور اس کے خلاف جہاد سے گُریزاں[2] ہے بلکہ بعض معاملات میں ان کی سپورٹر ہیں' جیسے بنک انٹرسٹ، جاگیرداری' مذہبی اجارہ داری وغیرہ۔ عوام اسلام کے مذہبی پہلو یعنی عقیدہ' عبادات اور رسومات کی حد تک عمل کر کے بڑے مطمئن ہیں۔ اوپر طاغوت کا نظام ہے اور باطل پوری طرح چھایا ہوا ہے لیکن ان کا سارا زور آپس کے مذہبی اختلافات کو ہوا دینے[3] پر خرچ ہو رہا ہے۔ یہی حقیقت ہے جسے کسی نے ایک شعر میں سمو[4] دیا ہے ؎

باطل کے اقتدار[5] میں تقویٰ کی آرزو[6]
کیسا حسیں فریب[7] ہے جو کھا رہے ہیں ہم

پوری قومی زندگی انسانوں کی حاکمیت' سودی نظام' اباحیت پرستی اور فحاشی پر مبنی ثقافت پر چل رہی ہے جبکہ یہ صرف انفرادی معاملات کی بنیاد پر تقویٰ کی منزلیں سر

(۱) تکبر (۲) پرہیز کرنا متنفّر (۳) بھڑکانا (۴) ملانا (۵) حکومت (۶) خواہش (۷) دھوکا

کر رہے ہیں اور اس نظام کو بدلنے کی جدوجہد کے لیے کوئی فکر نہیں ہے' اگر فکر ہے تو صرف اپنے مدرسوں اور مساجد کی۔ ان کی مساجد میں اگر اسلام کے بارے میں بات کرنے کی اجازت مانگی جائے تو سب سے پہلے یہ سوال ہوتا ہے آپ کا مسلک کیا ہے۔ چونکہ دینِ اسلام سے خود ہی دست بردار (۱) ہو چکے ہیں' اس لیے اصل بات مسلک ہے۔

اب آیئے اس بات کی طرف کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو کیا دے کر بھیجتا رہا ہے جس کی شہادت کا فریضہ وہ ادا کرتے رہے ہیں۔ تو فرمایا گیا کہ:

﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾
(الحدید:25)

"اور ہم نازل کرتے ہیں کتاب اور میزان تا کہ لوگوں میں عدلِ اجتماعی قائم ہو۔"

اور یہی دو چیزیں ہیں جن کے بارے میں سورۃ الشّوریٰ (آیت ۱۷) میں نبی اکرم ﷺ کے بارے میں ذکر کیا گیا:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ﴾

"اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے کہ جس نے کتاب نازل کی حق پر مبنی اور میزان۔"

یہ ہے دوسری حُجّت جو اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے ذریعہ کرواتا رہا ہے کہ وہ کتاب کی تعلیم پر مبنی عدلِ اجتماعی قائم کریں اور اس کتاب کی دعوت کو تمام انسانوں تک پہنچائیں جن کی طرف انہیں رسول بنا کر بھیجا جاتا رہا ہے۔ اس میزان کو ہی دین سے تعبیر کیا گیا ہے رسولوں کے بارے میں جیسے وارد ہوا۔ سورۃ الشّوریٰ میں ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ﴾ "دین

(۱) چھوڑنا

کے بارے میں تمہارے لیے وہی مُعیّن کیا گیا ہے جو ہم نے وصیت کی نوح علیہ السلام کو اور جو وحی کی گئی آپ کی طرف اے رسول ﷺ اور جو وصیت کی گئی تھی حضرات ابراہیم، موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کو کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفریق نہ کرو" اور انہی دو چیزوں کو بیان کیا گیا آپ ﷺ کے لیے تین مقامات پر اس صورت میں جو تقاضا ہوا تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت (۱) کا۔

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَي الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (الصّف:9' الفتح:28' التوبہ:33)

"وہ ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دینُ الحق دے کر تا کہ وہ غالب کریں اس دین کو باقی تمام ادیان (۲) یا پُورے کے پُورے دین پر۔"

یعنی پہلے رسولوں کے بارے میں جو ذکر ہے کتاب اور میزان کا اور مکّی قرآن میں جس کا ذکر کیا آپ ﷺ کے لیے بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو الہدیٰ اور دینُ الحق بنا دیا۔ آخری رسول اللہ ﷺ کے لیے کتاب کی جگہ الہدیٰ' کامل ترین ہدایت اور میزان کی جگہ دینُ الحق یعنی دینِ اسلام۔

اب جاننا ہے کہ جو شہادت کا فریضہ ذمہ داری تھی رسول اللہ ﷺ کی اور پھر ذمہ داری ٹھہرائی گئی خیرِ اُمّت کی' جیسے فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرہ:143)

اس کے تقاضے کیا تھے اور اور آپ ﷺ نے کیسے ادا کیے اور اب امت کیسے ادا کرے گی تو شہادت کا فریضہ ادا ہو جائے گا۔

(۱) نعمت کو پورا کرنا (۲) زندگی کے تمام نظام

الہُدیٰ کی شہادت

اللہ کی کتاب ایک پیغام لے کر آئی ہے اور وہی اس کی دعوت ہے پوری انسانیت کی طرف۔ اور وہ ہے دعوتِ ایمان۔ اس کائنات کے حقائق کو تسلیم کرنے کا نام ایمان ہے۔ یعنی یہ مانو کہ یہ کائنات خود بخود پیدا نہیں ہوئی اور نہ ہی خود بخود چل رہی ہے بلکہ ایک ہستی ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور وہی اب بھی اس کا حاکمِ حقیقی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿٦٢﴾﴾

(الزمر:62)

"اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو وجود بخشا ہے اور وہی سب چیزوں کا کارساز ہے"۔

یہ کائنات اور دنیا نہ ہمیشہ سے ہے اور نہ ہی ہمیشہ رہنے والی ہے بلکہ یہ ایک مُدّتِ مُعیّن[1] تک کے لیے ہے اور یہ با مقصد تخلیق ہے۔ اس لیے وہ دن آ کر رہے گا جس میں ہر چیز کی غرضِ تخلیق کا جائزہ لیا جائے کہ اس نے اپنا مقصد پورا کیا یا نہیں کیونکہ یہ بالحق[2] پیدا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ ہر مخلوق کو فطری صلاحیتیں اور رہنمائی عطا کی ہے جس کی بنیاد پر وہ مسئول ہے اور خاص کر انسان کو تو احسنِ تقویم[3] پر پیدا کیا گیا ہے، اس لیے وہ دن آ کر رہے گا جس دن یہ جانچا جائے گا کہ کس نے اس مقصدِ تخلیق کو پورا کیا۔ یہ ہے دعوت اس الہُدیٰ کی۔ چنانچہ اصل اساساتِ مسئولیت[4] یہ ہیں: عہدِ الست، علمُ الاسماء، سماعت، بصارت اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور پھر نیکی بدی کی تمیز، حق اور باطل کی پہچان۔

۱) ﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿١٧٢﴾ اَوْ تَقُوْلُوْٓا

(۱) مقررہ مدت (۲) بامقصد (۳) بہترین ساخت (۴) جوابدہی کی بنیادیں

اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿١٧٣﴾﴾ (الاعراف:172 تا 173)

"یاد کرو جب تیرے رب نے آدم کی تمام اولاد کو اپنے سامنے حاضر کیا اور ان کو خود ان کے نفس پر گواہ ٹھہرایا اور پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ سب نے اقرار کیا: کیوں نہیں ہم گواہ ہیں۔ یہ اس لیے کیا کہ مُبادا[1] تم قیامت کے دن کہہ دو کہ ہم اس سے غافل تھے۔ یا یہ نہ کہہ دو کہ ہمارے باپ دادا مشرک تھے اور ہم ان کی اولاد تھے ان کے بعد اس لیے مشرک ہو گئے، تو کیا تُو ہمیں ہلاکت میں ڈالے گا ان باطل کرنے والوں کی وجہ سے"۔

یہ ہے وہ عہد جو ہماری فطرت بنا دیا گیا ہے۔ (اس کی تفصیل عبادتِ رب میں آ گئی ہے)

۲) ﴿عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا﴾ (البقرۃ:31)

اللہ تعالیٰ نے آدم میں یہ صلاحیت پیدا کر دی کہ زمین پر جتنی چیزیں ہیں ان کی خاصیتیں جان لے اور ان سے فائدہ اٹھائے اور کام میں لائے اور ان کو پیدا کرنے والے کا احسان مانے اور شکر بجا لائے۔ (البقرہ) یہ ہے جس سے تمام سائنسی علوم اور عمرانی علوم[2] وجود میں آ رہے ہیں۔

۳) ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿٢٣﴾﴾ (الملک:23)

"وہ ہے (اللہ) جس نے تم کو پیدا کیا اور پھر تمہیں سماعت، بصارت اور سوچنے کی صلاحیت سے نوازا۔ بہت تھوڑا ہے جو شکر بجا لاتے ہو"۔

۴) ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ﴿٨﴾﴾ (الشّمس:8)

"الہام کر دیا اس کی نافرمانی اور تقویٰ اس کے نفس میں"۔

(۱) ایسا نہ ہو (۲) معاشرتی علوم

وہ خوب جانتا ہے نیکی کیا ہے، برائی کیا ہے اور میرا کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ یہ ہیں ہر انسان کو ودیعت کی ہوئی بنیادیں جو مسئولیّت کے لیے ہیں۔

اس لیے فرمایا وہ قیامت کا دن' یومُ الآخر تو لازم ہے کیونکہ وہ تیرے رب کی رحمت کا ظہور ہے تا کہ وہ اُن انسانوں کو نوازے جنہوں نے اپنا مقصد تخلیق پورا کیا ہو۔

﴿كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ (الانعام:12)

"اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے رحمت کو لازم کر لیا ہے اس لیے وہ تمہیں ضرور جمع کرے گا قیامت کے دن جس کے بارے میں کوئی شک ہے ہی نہیں۔"

انبیاء و رُسل کے ذریعے تو انسانوں پر حجت قائم کر دی گئی ہدایت نازل کر کے اور اس پر عمل کروا کر۔ چنانچہ یہ دعوت دی جاتی رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کُتب نازل کرتا رہا ہے وہ اس کا کلام ہے جسے وہ رُوحُ الامین (۱) کے ذریعے انسانوں میں سے چنیدہ (۲) انسانوں تک پہنچاتا رہا ہے اور وہ انسان جو انبیاء و رُسل ہیں وہ عمل کر کے دکھاتے رہے ہیں اور اُمت کے لیے اُسوۂ حسنہ بنتے رہے ہیں۔

چنانچہ یہ ہے وہ پیغام جو الہُدیٰ کے ذریعہ نازل کیا گیا اور اس کی تبلیغ' دعوت اور اخلاقِ حسنہ کے ذریعہ اس کا نمونہ دیا تمام انبیاء اور رُسُل نے اور خاص کر محمد رسول اللہ ﷺ نے۔

اب اُمت پر اس کی شہادت کے یہی تقاضے ہیں کہ اُمت اپنے دور کے انسانوں تک سب سے پہلے اس کا پیغام پہنچائے' اسی کا نام تبلیغ ہے۔ چنانچہ پہلا حق الہُدیٰ کا یہی ہے۔ لیکن یہ حق اب یوں ادا ہوگا کہ یہ پیغام تمام قوموں تک ان کی زبان میں پہنچایا جائے اور اس کے لیے تمام ذرائع اِبلاغ استعمال کیے جائیں تا کہ حق تبلیغ ادا ہو۔ تبلیغ لوگوں تک پیغام پہنچانے کا نام ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہمارے پاس کتاب ہے' اسے آ کر

(۱) حضرت جبرائیل علیہ السلام کا لقب (امانتدار روح) (۲) چُنے ہوئے

پڑھ لو۔ نہیں..... اس کو ایک مثال سے سمجھ لیں۔ کچھ لوگوں کو پانی کی ضرورت ہے۔ پانی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ کنویں' تالاب میں پانی موجود ہے' ڈول لے کر جاؤ اور پانی لے لو۔ یہ تبلیغ نہیں ہے بلکہ پانی خود ان لوگوں تک پہنچنا چاہیے اور یہ کام کرتا ہے بادل کہ وہ خود پانی لے کر جا پہنچتا ہے۔ تو یہ ہے تبلیغ کا عمل جو بادل ادا کرتا ہے۔ چنانچہ آج افراد کی بھی ضرورت ہے کہ وہ مختلف زبانیں سیکھیں اور قرآن کے پیغام کو تمام قوموں تک ان کی زبان میں پہنچائیں۔ لیکن اس کا مؤثر ذریعہ آج ٹیلی ویژن' انٹرنیٹ' ریڈیو' اخبارات' رسائل اور آڈیو ویڈیو ہیں۔ جب تک یہ ذرائع استعمال نہ ہوں گے' حقِ تبلیغ ادا نہ ہوگا۔

دوسرا حق الہُدیٰ کا یہ ہے کہ پھر ان قوموں میں سے کچھ افراد کو نکال کر لایا جائے اور اُن کو تفصیل کے ساتھ اسلام اور قرآن کی تعلیم دی جائے جسے قرآن مجید دعوت کا نام دیتا ہے۔

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (النحل:125)

"دعوت دو اپنے رب کے راستہ یعنی صراطِ مستقیم کی طرف دلیل کے ساتھ' اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان سے مناظرہ کرو بہترین طریقہ پر۔"

یہ ہیں تین طریقے دعوتِ قرآن کا حق ادا کرنے کے۔ ایک گروہ وہ ہونا چاہیے جو قرآنِ مجید کی حکمت حاصل کرے اور پھر دوسروں کے باطل فلسفے پڑھے اور پھر قرآن و حدیث کی تعلیم کے ذریعہ ان کا باطل ہونا ثابت کرے اور صحیح نظریات اور حکمتِ قرآنی عام کرے۔ دوسرا گروہ وہ تیار ہو جو عوام الناس تک قرآن کی تعلیم اچھے وعظ کے ذریعے پہنچائے اور تیسرا گروہ وہ ہو جو دوسرے مذاہب کا پرچار کرنے والوں کے ساتھ مناظرہ کرے۔ ان کا غلط ہونا عوام کے سامنے لائے تا کہ ان کے اثرات سے عوام الناس بچ سکیں۔

تیسرا حق الہُدیٰ کا یہ ہے کہ اس کی وہ اقدار[1] اور اخلاقِ حسنہ[2] جو وہ معاشرے میں پروان چڑھانا چاہتا ہے ان کو عام کیا جائے اور جن رذائلِ اخلاق[3] کی وہ نکیر[4] کرتا ہے ان کی شناعت اور برائی کو مبرہن[5] کیا جائے۔ یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر باللِّسان، عبدیت، سچائی، امانت و دیانت، عہد کی پاسداری، صلہ رحمی، صبر و شکر، حیاء اور توکُّل علی اللہ کے اوصاف کے نمونے پیدا کیے جائیں اور ان کی ترویج ہو اور تکبر و غرور، جھوٹ، بد دیانتی، بدعہدی، قطع رحمی، غصہ و غیبت، بے حیائی اور فحاشی اور اوہام پرستی جیسی برائیوں کے بارے میں آگاہ کیا جائے اور ان کے مضر اثرات سے معاشرے کو بچانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے لیے بھی تمام ذرائع ابلاغ کو استعمال کیا جائے اور پھر کردار کے عملی نمونوں کے ذریعہ مثالیں قائم کی جائیں۔

یہ ہیں تین حق جو الہُدیٰ کی شہادت کے لوازمات[6] ہیں اور فریضہ کی ادائیگی اس کے بغیر پوری نہیں ہوتی۔

(۱) قدر کی جمع = عزت، بزرگی (۲) عمدہ عادتیں (۳) بُرے اخلاق (۴) روکنا
(۵) واضح کرنا (۶) لوازم کی جمع = ضروری چیزیں

دین الحق کی شہادت

دوسری چیز ہے المیز ان اور اس کی شہادت جسے قرآن مجید میں اب دینُ الحق قرار دیا گیا ہے۔ اس شہادت کی اہمیت اس سے عیاں[1] ہوتی ہے کہ سورۃ الحج کی آخری آیت میں بھی ذکر دین ہی کا ہے:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ۚ﴾ (الحج:78)

"اور دین کے بارے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کا طریقہ ہے جس نے تمہارا نام مسلمان رکھا اور اس قرآن میں بھی تمہیں مسلمان قرار دیا گیا ہے تاکہ رسولُ اللہ ﷺ تم پر گواہ بن جائیں اور پھر تم گواہ بن جاؤ تمام انسانیت کے لیے۔"

سورۃُ الحدید میں انبیاء و رُسُل کی بعثت کی غرض و غایت یہی قرار پائی کہ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید:25) تاکہ لوگوں میں عدلِ اجتماعی قائم ہو جائے میزان کے ذریعہ۔ اور پھر نبی اکرم ﷺ کے لیے جو خُصوصی آیات نازل کی گئیں ان میں دینُ الحق کا مقصد یہ قرار پایا کہ اسے تمام ادیان پر غالب کیا جائے۔ یہ نہایت ضروری ہے کیونکہ عوام اکثر و بیشتر جس نظام کے تحت ہوں ان کے لیے اس کے خلاف عمل کرنا ناممکن ہوتا ہے اور وہ تابع ہوتے ہیں حکمرانوں اور جاگیرداروں کے، کیونکہ انہی کا دین ان پر مسلّط[2] ہوتا ہے۔

(۱) ظاہر (۲) غالب

دین کیا ہے؟

اب جان لینا چاہیے کہ دین ہوتا کیا ہے۔ دین کے بنیادی معنی تو بدلہ کے ہیں جیسے سورہ فاتحہ میں آیا' مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ "اللہ تعالیٰ مختار مطلق ہے بدلے کے دن کا"۔ لیکن یہ بدلہ کس بنیاد پر ہوتا ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ یہ کسی قانون' دستُور کی بنیاد پر ہوتا ہے کہ جس کے ماننے اور نہ ماننے پر جزا وسزا ہوتی ہے۔ اس لیے دین نام ہے اس دستُور العمل اور ضابطۂ حیات کا جو اجتماعی زندگی کی بنیاد ہوتا ہے اور ساری ریاست کے لیے مُعیّن ہوتا ہے کہ اس کے تحت ان کے معاملات طے پائیں۔

اس لیے دین کی نسبت اس ہستی کی طرف ہوتی ہے جو یہ دستُور بنانے اور اس میں ردّوبدل کا اختیار رکھتا ہو جیسے سورۂ یوسُفؑ میں آیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس روکنا چاہتے تھے لیکن جو دینُ الملِک وہاں رائج تھا اس کے تحت نہ روک سکتے تھے بلکہ انہوں نے شریعتِ ابراہیمی کا سہارا لیا جس میں چور کی سزا یہ مقرر تھی کہ اگر چوری ثابت ہوجائے تو چور کو اس کی غلامی اختیار کرنا پڑتی تھی جس کی اس نے چوری کی ہوتی تھی اور اس قانون کے تحت حضرت یوسف علیہ السلام نے تدبیر کی اور بھائی کو روک لیا۔ یہی اِطلاق ہوتا ہے آج کل کے جمہوری نظام کے لیے۔ یہ دینُ الجمہُور ہے کیونکہ یہاں اختیار جمہور کے نمائندوں کے پاس ہوتا ہے۔ یہی دین اس وقت دینُ الحق قرار پائے گا جب یہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے ضابطۂ حیات کے موافق ہوجائے گا اور یہی فریضہ رہا ہے ہر رسول کا کہ وہ اس دین کو قائم کرے جس میں دستورُ العمل یہ قرار پائے کہ تمام معاملات میں یہ طے کرلیا جائے کہ کوئی قانون نہ بنایا جاسکے گا جو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے خلاف ہو۔

اس لیے یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو کیوں ہمیشہ ہر قوم کے دارُالخلافہ میں مبعُوث[1] فرماتا رہا ہے۔ ہر قوم میں رائج نظام دارُالخلافہ میں قابض

(۱) بھیجنا

بادشاہ/سردارانِ قوم کا دیا ہوا ہوتا ہے اور جب تک اسے نہ بدلا جائے دوسرا کوئی دستُور رائج نہیں ہوسکتا کیونکہ کسی ریاست/مُلک میں دو دستُور نافذ نہیں ہوسکتے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَمَا كُنَّا مُهْلِكِى الْقُرٰٓى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ﴾ (القصص:59)

"اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا رہا یہاں تک کہ اس کی مرکزی بستی (دارالخلافہ) میں رسول نہ بھیج دے جو اِن کو پڑھ کر سنائے ہماری آیات۔ اور ہم نہیں ہلاک کرتے رہے بستیوں کو مگر اس وقت جب ان کے رہنے والے ظلم کرنے لگے۔"

اور یہ ظلم کرتے رہے ہیں تمام قوموں کے سردار کہ اللہ کے رسول کے آنے کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے اور اپنے ظالمانہ نظام کو نہیں بدلتے کیونکہ ان کے مفادات اور حیثیت اسی استحصالی نظام کی بنیاد پر ہوتی ہے جو وہ چلا رہے ہوتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصدِ بعثت

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ (الشوریٰ:7)

"اور اس طرح ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف قرآنِ عربی وحی کیا ہے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگاہ کردیں مکہ والوں کو اور جو ان کے چاروں طرف ہیں اور آگاہ کردیں اس جمع ہونے کے دن کے بارے میں جس کے بارے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔"

عرب میں اگرچہ کوئی مرکزی حکومت نہ تھی لیکن دین کے لحاظ سے سِکّہ قریش ہی کا پورے عرب پر جاری تھا اور وہی ان کے دینی پیشوا[1] تھے اور پورا عرب ان کے تابع

(۱) رہنما

تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مکہ والوں نے دینُ الحق کو قبول نہیں کیا تو سیدُ المرسلین ﷺ ، کو بھی اسی طرح ہجرت اختیار کرنا پڑی جیسے پہلے رسولوں کو کرنا پڑی تھی اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ مدینہ میں آپ ﷺ کی حیثیت کو مان لیا گیا اور پورا مدینہ آپ ﷺ کے تابع ہو گیا لیکن عرب کے تمام قبائل ایمان نہیں لائے اور نہ ہی اس تبدیلی کو "دینِ عرب" کی تبدیلی مانا گیا کیونکہ مدینہ والوں کا دین عرب میں رائج نہ تھا، لیکن جب مکّہ فتح ہو گیا تو پھر پورا عرب اسلام لے آیا اور دینُ الحق پورے عرب پر قائم ہو گیا کیونکہ نظامِ شرک کا خاتمہ ہو گیا اور اس کا اختیار رکھنے والے اور اسے رائج کرنے والے مغلوب ہو گئے۔

تخریب (۱) حَسیں کر دیتی ہے تعمیر کے نقشِ ناقِص (۲) کو
بُت خانے کی قسمت کیا کہیئے اُجڑے تو حَرَم (۳) بن جاتا ہے

اس سے پہلے عرب کے عوام کو دینُ الحق اختیار کرنے میں کتنی دشواری تھی اور عوامُ الناس کس طرح مجبور تھے لیکن دین اسلام کے اُمّ القُریٰ میں غالب ہونے سے تمام رکاوٹیں دور ہو گئیں اور تمام عرب کے لیے آسانی پیدا ہو گئی تا کہ دینُ الحق کے تحت اپنا مقصد زندگی پورا کر سکیں۔ ۵ھ میں سورۃُ النّور میں اسی لیے مسلمانوں کو یہ بشارت دی گئی تھی کہ جلد ہی یہ خوف و ہراس ختم ہو جائے گا اور اللہ اپنے دین کو تمکُّن (۴) عطا کرے گا اور تمہیں خلافت ارضی سے نوازے گا۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (النور:55)

"اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اپنے مومن بندوں سے جو عَمَلِ صالح اختیار کیے

(۱) بربادی (۲) غیر مکمل نقش (۳) خانہ کعبہ (۴) غلبہ

ہوئے ہیں کہ ان کو لازماً زمین کی خلافت عطا کرے گا جیسے اس نے پہلوں کو خلافت عطا کی اور لازماً ان کے دین کو جس کو اس نے پسند فرمایا ہے تمکِنَت (۱) عطا کرے گا اور ان کی خوف کی حالت لازماً امن میں بدل دے گا تا کہ وہ میری بندگی کا حق ادا کرتے ہوئے زندگی گزاریں اور میرے مقابلے میں کوئی معبود نہ رہے۔ پھر اگر کوئی کفر کی روش (۲) اختیار کرے گا تو وہ ہو گا اصل میں نافرمان۔"

یہ ہے وہ غلبۂ دینُ الحق جو اللہ تعالیٰ تمام رسولوں کا مقصدِ بعثت قرار دے رہا ہے اور دنیا میں اس کا نفاذ بالفعل کرتا رہا ہے۔ یہ اتنا اہم فریضہ تھا کہ اگر باطل نظام کے بااختیار مُترِفین نے اس کو قبول نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ ان کو اور پوری قوم کو ہلاک کرتا رہا ہے اور پھر اپنے رسولوں اور ان کے ماننے والوں کے ذریعہ اس دَور کے حالات کے مطابق دنیا میں وہ نظامِ حق رائج کرواتا رہا ہے جو ان کو دے کر بھیجتا تھا کیونکہ یہی فریضہ رہا ہے ہر رسول کا جیسے سورۃُ الحدید کی آیت نمبر 25 میں فرمایا: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ یہی ہوا ہے حضرت نوح، ہود، شعیب اور موسیٰ علیہم السلام کے ذریعہ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول سیدُ المُرسلین ﷺ کی قوم کو ہلاک نہیں کیا۔ اگرچہ ۱۳ سال تک ان کو دعوت دینے کے باوجود انہوں نے نہیں مانا اور پہلے رسولوں کی طرح آپ ﷺ کو ہجرت کرانا پڑی۔ اس لیے کہ آپ ﷺ آخری رسول تھے اور آپ ﷺ کے بعد یہ فریضہ اُمت کے سپرد ہونے والا تھا۔ اگر آپ ﷺ کے دَور میں بھی یہ کام معجزہ سے ہو جاتا تو بعد والوں کے لیے نمونہ نہ بنتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے غلبۂ دینِ حق انسانی جدوجہد کے ذریعہ کروایا اور ان تمام مراحل سے اپنے رسول اور اُمّت کو گزارا جو اس کے لیے ناگزیر تھے تا کہ بعد والوں کے لیے اُسوۂ حَسَنہ (۳) موجود رہے اور اُمّت اپنا فریضہ ادا کرنے کے لیے رہنمائی حاصل کرتی رہے۔

(۱) شان وشوکت (۲) طور طریقہ (۳) بہت اچھا نمونہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصی حیثیت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصدِ بعثت قرآنِ مجید میں تین مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ اگر ان مقامات کا سیاق وسباق دیکھا جائے تو بات زیادہ نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔

پہلی دفعہ یہ آیت نازل ہوئی سورۃ الصّف میں:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ (الصّف:9)

"وہ اللہ ہے جس نے بھیجا اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو الہُدیٰ اور دینُ الحق دے کر تاکہ دین الحق کو غالب کریں تمام ادیان پر اگرچہ مشرکوں کو کتنا ہی ناپسند ہو۔"

یہ وہ موقع تھا جب پورا عرب جمع ہو کر مدینہ پر چڑھ دوڑا تھا اور مسلمانوں پر بہت کڑا وقت تھا۔ ان حالات میں فرمایا گیا کہ گھبراؤ نہیں، ہم نے تو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا ہی اس لیے ہے کہ وہ دینُ الحق کو غالب کریں تمام ادیان پر۔ لیکن اس کے لیے جان و مال تو ایمان والوں کو لگانا پڑے گا اور دیکھو عنقریب ہم تمہیں غلبہ عطا فرمائیں گے اور اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسلمانوں کو بشارت دیجیے۔

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَیُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝۱۲ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۱۳﴾ (الصّف:10 تا 13)

"اے ایمان والو! میں بتلاؤں تم کو ایسی سوداگری جو بچائے تم کو ایک عذابِ دردناک سے۔ ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں، اپنے مال سے اور اپنی جان سے، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ بخشے گا وہ تمہارے گناہ اور داخل کرے گا تم کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں اور ستھرے گھروں میں بسنے کے باغوں کے اندر۔ یہ ہے بڑی مراد ملنی اور ایک اور چیز دے جس کو تم چاہتے ہو۔ مدد اللہ کی طرف سے اور فتح جلدی اور خوشی سنا دے ایمان والوں کو۔"

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بعد فرما دیا تھا: اے مسلمانو! اب قریش تم پر دوبارہ حملہ آور نہ ہو سکیں گے بلکہ تم قریش پر حملہ آور ہو گے۔

لیکن پھر دوبارہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب صلح حدیبیہ سے یہ مغالطہ پیدا ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا تھا کہ دینُ الحق تمام ادیان پر غالب ہو گا لیکن یہاں یہ مان لیا گیا کہ دینِ قریش بھی جاری رہے اور دینُ الحق بھی اور اس معاملے میں باہم جنگ نہ ہو گی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے پھر آیت نازل فرمائی اور واضح کیا کہ ہم نے رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی لیے بھیجا ہے کہ دینُ الحق غالب ہو (یعنی یہ صلح کا معاملہ اور دینِ قریش کو مہلت کا معاملہ وقتی/عارضی ہے) اور جان لو اللہ تعالیٰ کافی ہے مددگار یا گواہ کہ یہ ہو کر رہے گا۔

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا﴾ (الفتح:28)

چنانچہ تقریباً ڈیڑھ سال میں دینُ الحق کا غلبہ ہو گیا۔ فتح مکّہ کے ساتھ ہی تمام عرب نے دینِ اسلام کے غلبہ کو قبول کر لیا اور اللہ کی حکمرانی پورے عرب میں نافذ ہو گئی کیونکہ پہلا دین اور اس کے محافظ مغلوب ہو گئے۔ گویا وہ مقصد جو تمام رسولوں کا تھا کہ

لوگوں میں عدلِ اجتماعی قائم ہو وہ پورا ہو گیا۔ اب پھر تیسری بار اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ کو نازل کیا اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کہ دینُ الحق کا غلبہ صرف مشرکینِ عرب کے دین پر ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس دینُ الحق کو سابقہ تمام ادیان پر بھی غالب کرنا ہے کیونکہ ان کی مدت ختم ہو گئی اور اب وہ دین نہیں رہے بلکہ اب تمام انبیاء و رسل کے امتیوں کو بھی اسی دینُ الحق کے تابع رہنا ہوگا اور انفرادی طور پر اگر وہ چاہیں تو اپنے دین کو مذہب کے طور پر جاری رکھیں یعنی عقائد، عبادات و رسومات کی حد تک اپنے دین پر عمل کرتے رہیں لیکن اجتماعی زندگی میں ان کو دینُ الحق کے تابع رہنا ہوگا۔ چنانچہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ:

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴾

(التوبہ:29)

"اے مسلمانو! تمہاری جنگ جاری رہنا چاہیے ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور ان کے ساتھ جو ان چیزوں کو حرام قرار نہیں دیتے جنھیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے اور ان کے ساتھ جو دینُ الحق کو اپنا دین نہیں مانتے اہلِ کتاب میں سے بھی یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کریں اور دین الحق کے نیچے رہ کر زندگی گزاریں"۔

یہ ہے وہ مقصد جو سیّدُ المُرسَلین [1] احمدُ المجتبیٰ اور آخرُ الرُسل ﷺ کا قرار دیا گیا ہے کہ وہ دینُ الحق جو اُن کو دیا گیا ہے وہ تمام زمین پر غالب ہو اور باقی تمام ادیان اس کے تابع ہو جائیں اور مذہب کی حیثیت سے چاہے جاری رہیں لیکن وہ دین کے طور پر رائج

(۱) نبیوں کے سردار ﷺ

نہیں رہنے چاہئیں۔

لیکن صد افسوس ہے کہ جن اہلِ کتاب کے بارے میں حکم آ گیا تھا کہ ان کو اپنا دین اب دین الحق بنانا ہوگا اور اگر دینُ الحق کو قبول نہ کرنا ہو تو اپنے دین کو مذہب بنالیں یعنی انفرادی زندگی میں اسی پر عمل پیرا رہیں لیکن اجتماعی اور ریاستی معاملات میں ان کو دینُ الحق کے تابع [1] رہنا ہوگا کیونکہ یہی دین ہے جو اللہ تعالیٰ نے اب ساری انسانیت کے لیے قیامت تک پسند فرما لیا ہے، وہ آج اپنا دین تمام دنیا پر غالب کیے ہوئے ہیں اور مسلمان، حاملِ الہُدیٰ اور دینُ الحق ان کے دین کے تحت مذہب اسلام پر عمل پیرا ہیں اور گویا جزیہ [2] ادا کرتے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں۔

(۱) ماتحت (۲) وہ ٹیکس جو اسلامی حکومت میں غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے۔

التزامِ جماعت

یہ حالت کیوں ہوئی‘ اس لیے کہ دینِ اسلام کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر لازم کر دیا تھا کہ وہ جماعتی زندگی کا التزام[1] کریں اور اجتماعی قوت کے ساتھ اس دین کو غالب رکھیں لیکن جب دین و دنیا کی تقسیم مسلمانوں میں راسخ[2] ہوئی تو دین مذہب بن گیا اور دنیا میں سیاسی اقتدار علیحدہ سمجھ لیا گیا اور جب امت میں ذاتی اِقتدار کی ہَوَس کے تحت علاقائی حکومتیں بن گئیں تو اجتماعیت ختم ہوگئی اور امت قوموں میں بٹ گئی اور سیاسی اقتدار سے محروم ہوگئی۔ گویا دینُ الحق والا حصہ ان سے چھن گیا اور وہاں مغرب کی اجارہ داری قائم ہوگئی اور مسلمان صرف مذہبِ اسلام کو ہی سب کچھ سمجھ کر اس پر قانع[3] ہوکر زندگی گزارنے لگے اور اس کی بنیاد پر مسلکوں میں بٹ گئے اور ان کی قوت پارہ پارہ ہوگئی اور مذہب کے لیے چونکہ اجتماعی زندگی ضروری نہیں تھی اس لیے جماعتی نظم ختم ہوگیا۔ اب علماء کرام جو اصل دین کے حامل تھے وہ چونکہ مذہبِ اسلام پر عمل پیرا ہیں اس لیے ان کے ہاں کوئی نظمِ جماعت نہیں ہے حالانکہ دینِ اسلام/ دینُ الحق کا تو تصور بغیر جماعتی زندگی کے محال ہے۔ اس جماعت کی شرائط یہ ہیں کہ وہ دین کے غلبہ کے لیے ہو‘ اس کا نظم سمع و طاعت کی مسنون نہج[4] پر ہو‘ اس کی قیادت میں لِلّٰہیت[5] نظر آئے۔ اسی لیے سورہ الصّف ہی میں فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ (الصّف:14)

”اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بن جاؤ۔“

اور ہمارے رسول کی نداء پر لبیک کہتے ہوئے خود کو جماعتی نظم میں دو جس کی رسولُ اللہ ﷺ نے بَیعَتِ عقبہ ثانیہ کے موقع پر ابتدا فرمائی کہ مدینہ کے 75 افراد میں سے ۱۲ نقباء مقرر کیے اور پھر ان کی اطاعت کے لیے بیعت لی۔ چنانچہ حضرت عبادہ بن

(۱) لازم کرنا (۲) پختہ (۳) جو مل جائے اس پر راضی رہنا (۴) طریقہ
(۵) خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہونا۔

الصامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ، وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ، وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا، وَعَلٰى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ، وَعَلٰى اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ)) (مُتّفق علیہ)

”ہم نے بیعت کی رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سننے اور ماننے کی‘ آسانی میں بھی اور تنگی میں بھی‘ دل کی آمادگی پر بھی اور کراہت پر بھی اور اس پر بھی کہ خواہ ہم پر دوسروں کو ترجیح دے دی جائے اور ہم جھگڑا نہ کریں گے اَہلِ امر کے ساتھ اور حق بات کہنے کی جہاں موقع ہو اور اللہ کے معاملے میں ہم کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہ کریں گے۔“

یہ ہے دین کے لیے اجتماعیت کی بنیاد اور جس کے بارے میں ارشاد ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا:

لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ (سُنَن دارمی)

”اسلام کا کوئی تصور نہیں ہے بغیر اجتماعیت کے“

اور قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

((يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ)) ”اللہ کی تائید اور نصرت جماعت کے ساتھ ہوتی ہے“

اور جس کے بارے میں ایک دوسرا فرمان نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے:

((عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَاِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ فَاِنَّ الشَّيْطٰنَ مَعَ الْوَاحِدِ وَهُوَ مِنَ الْاِثْنَيْنِ اَبْعَدُ مَنْ اَرَادَ بُحْبُوْحَةَ الْجَنَّةِ فَلْيَلْزَمِ الْجَمَاعَةَ)) (الترمذی)

”اے مسلمانو! جماعت کا التزام کرو اور انفرادی زندگی گزارنے سے بچو‘ کیونکہ جب انسان اکیلا ہو تو شیطان ساتھی بن جاتا ہے اور جب دو انسان

جماعت کی صورت اختیار کرلیں تو وہ ان سے دور رہتا ہے۔جس کو جنت کی
خوشگواری مطلوب ہواس کوالتزام جماعت کرنا چاہیے۔"

اگر آج امّتِ مسلمہ کو یہ بھولا ہوا سبق یاد کروا دیا جائے کہ دینِ اسلام کا لازمی تقاضا جماعتی زندگی ہے کہ اس کے بغیر دینُ الحق کا غلبہ ممکن نہیں اور ہر مسلمان پر التزام جماعت لازم ہے لہٰذا آج بھی مسلمان یکجا ہوکر دین کے غلبہ کے لیے جماعت بنائیں اور پھر دین کو اپنے ملک میں غالب کرنے کے لیے جہاد کرنا شروع کردیں جیسے جہاد کا حق ہے تو آج پھر دینُ الحق غالب ہوسکتا ہے اور نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت مکمل ہو سکتا ہے اور پوری زمین پر اللہ کی حکمرانی رائج ہوسکتی ہے اور دوبارہ خلافتِ راشدہ کا نظام قائم ہوسکتا ہے جس کے لیے پیشینگوئی کررکھی ہے نبی اکرم ﷺ نے کہ یہ دین تمام رُوئے ارضی پر غالب ہوکر رہے گا اور ہر جگہ میں داخل ہوکر رہے گا خواہ گھر والے کی عزّت کے ساتھ یا گھر والے کی ذلّت کے ساتھ یعنی وہ مغلوب ہواور جزیہ ادا کرے اور دین الحق کی حکمرانی کے زیرِ سایہ زندگی گزارے۔

یہی دعوت ہے اور فریضہ ہے جس کی خاطر تنظیمِ اسلامی بنائی گئی ہے کہ مَسلکوں سے اوپر اُٹھ کر دین کے غلبہ کے لیے کام کیا جائے کیونکہ مسلک تو سارے اسلام کے اندر ہی ہیں لیکن دینِ اللہ کہیں غالب نہیں ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دیے ہوئے ضابطۂ حیات کو کسی ملک میں بھی غلبہ حاصل نہیں ہے۔کہیں شہنشاہیت چل رہی ہے اور کہیں جمہوریت حالانکہ مطلوب ہے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور انسانوں کی خلافت جو پابند ہو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کی۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور تمام مسلمانوں کو اپنا مقام پہچاننے اور فضیلتِ امّت[1] کو حاصل کرنے اور اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(اور ہمارا آخری قول یہ ہے کہ تمام تعریفیں اور شکر اس اللہ کے لیے ہیں
جو تمام جہانوں کا رب ہے۔)

---

(۱) اُمت کی بڑائی، برتری